ResearchGate

See discussions, stats, and author profiles for this publication at: https://www.researchgate.net/publication/334250220

Tareekh e Pakistan Kay Mutnaza Advaar-Urdu-2nd Ed تاریخ پاکستان ک□ متنازع□ ادوار

Book · July 2019

CITATIONS
0

READS
35,516

1 author:

Tipu Makhdoom
Awais Law Associates, Lahore

17 PUBLICATIONS 0 CITATIONS

SEE PROFILE

Some of the authors of this publication are also working on these related projects:

History View project

Literature View project

All content following this page was uploaded by Tipu Makhdoom on 05 July 2019.

The user has requested enhancement of the downloaded file.

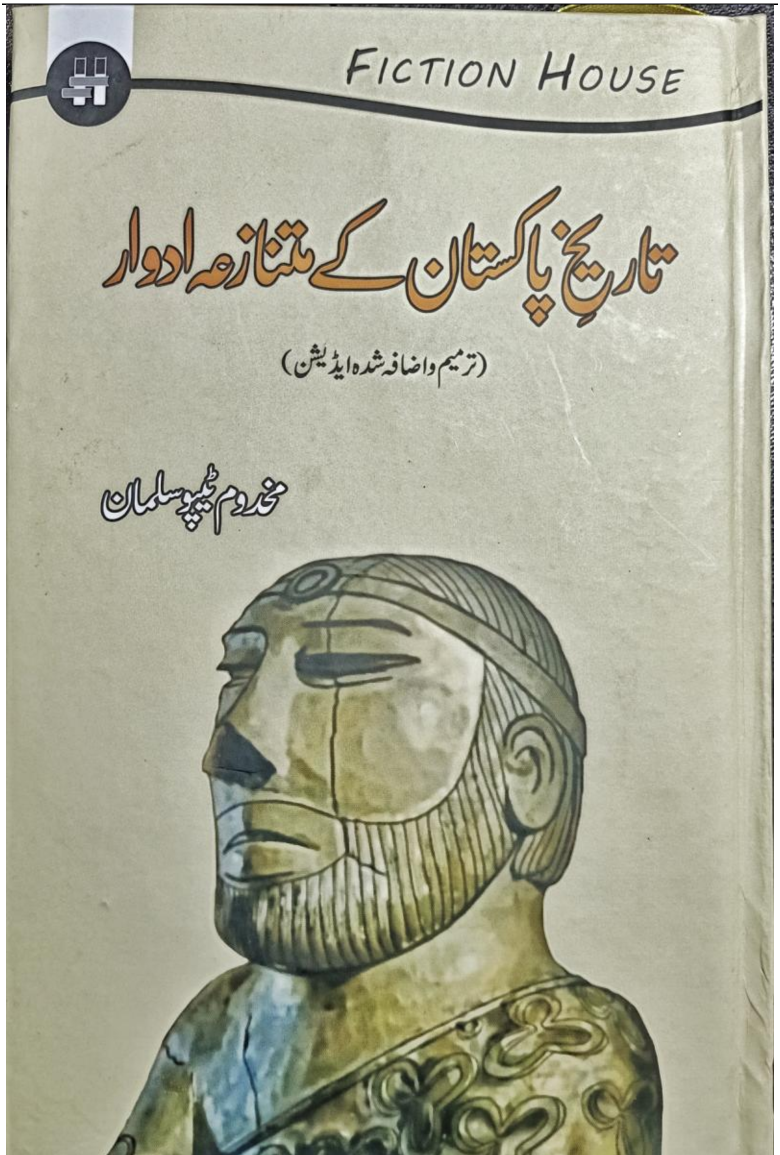
FICTION HOUSE
تاریخِ پاکستان کے متنازعہ ادوار
(ترمیم واضافہ شدہ ایڈیشن)
مخدوم ٹیپو سلمان

فہرست

دیباچہ (دوسرا ایڈیشن) 7

تعارف (پہلا ایڈیشن) 9

پہلا باب

تاریخ، حقائق اور کہانی 11

دوسرا باب

ہڑپہ سے گندھارا 17

(8000 ق۔م سے 500 عیسوی)

تیسرا باب

عرب اور غزنوی 45

(700ء سے 1100ء)

چوتھا باب

تغلق، وجے نگر اور بھگتی تحریک 67

(1300ء سے 1500ء)

پانچواں باب

اکبر اعظم 77

(1542ء سے 1605ء)

چھٹا باب

یورپی، سکھ اور مرہٹے 95

(1500ء سے 1800ء)

ساتواں باب

تحریکِ پاکستان 109

(1857ء سے 1947ء)

کتابیات 141

دیباچہ
(دوسرا ایڈیشن)

تاریخ کی کہانی بیان کرنا ایک مشکل کام ہے۔ وہ اِس لئے کہ واقعات کی رونمائی میں جو وجوہات کارفرما ہوتی ہیں، وہ اکثر اُن وجوہات سے یکسر مختلف، اور بہت دفعہ متضاد ہوتی ہیں، جو ہم سمجھتے یا سمجھنا چاہتے ہیں۔ اپنی خواہشات کے مطابق تاریخ کو لکھنا یا اس طرح سے لکھی گئی تاریخ کو پڑھنا ایک خوش آئند کام ہوتا ہے۔ مگر تاریخ کو تمام پہلوؤں سے پرکھ کر اصل کارفرما وجوہات پر مبنی تاریخ لکھنا ایک مشکل کام ہوتا ہے۔ ایسی تاریخ کو پڑھنا اِس سے بھی مشکل کام ہوتا ہے۔

اِس کتاب میں پاکستان کے علاقے کی تاریخ مختصر اور آسان زبان میں بیان کی گئی ہے تاکہ ہر شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والا پاکستانی اپنی تاریخ سے بنیادی واقفیت حاصل کر سکے۔ تاریخ کے صرف ان ادوار اور ان زاویوں پر بات کی گئی ہے جن پر تدریسی کتب عام طور پر خاموش رہتی ہیں۔

کتاب کے پہلے ایڈیشن کی کامیابی نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ ہم لوگ تاریخ کا شعور رکھتے ہیں۔ ہم لوگ تدریسی کتب میں بیان کئے گئے بیانیے کے علاوہ تاریخ کے دوسرے بیانیوں کو بھی پڑھ کر اپنا تاریخی شعور خود تشکیل دینا چاہتے ہیں۔

یہ بہت خوش آئند بات ہے۔

بیانیہ مختصر اور زبان آسان رکھنے کی خاطر متن میں بہت زیادہ تبدیلیاں نہیں کی گئیں۔ پھر بھی کچھ اضافے اور تبدیلیاں ناگزیر تھیں، جو کر دی گئیں ہیں۔

امید ہے کہ قاری کتاب کی پذیرائی جاری رکھیں گے۔

مخدوم ٹیپو سلمان

اپریل2019ء

تعارف

(پہلا ایڈیشن)

یہ کتاب ایک معصوم سوال کا نتیجہ ہے۔ بارہویں جماعت کے ایک کم سن نوجوان نے ایک روز مجھ سے پوچھا کہ ہمارے خطہ ء پاکستان کی تاریخ تو نہایت سنہری ہے۔ ہماری تاریخ تو نیک دل، رحمدل، عوام دوست اور جذبہ ء ایمانی سے منور مسلمان حکمرانوں سے مزّین ہے، جن کا ہزار سالہ دورِ حکومت مثالی رہا ہے۔ پھر اچانک پاکستان بنتے ہی کیا ہو گیا کہ تاریخ کے دھارے نے اپنا رخ ہی پھیر لیا؟ اب اچانک کیوں ہمارے عوام اور حکمرانوں میں جذبہ ء ایمانی منقود ہو گیا ہے، لالچ اور خود غرضی کا راج ہو گیا ہے اور جہالت کا اندھیرا روز بروز گہرا ہوتا دکھائی دیتا ہے؟

اس سوال کی معصومیت سے زیادہ اس کی سچائی نے مجھے سوچنے پر مجبور کیا اور جب نصاب میں پڑھی ہوئی تاریخ کو یادداشت سے کھنگالنے پر جواب نہ ملا تو میں نے تاریخ کی چند مشہورِ زمانہ کتب کا مطالعہ کیا۔ یہ کتب، جن میں سے اکثر کتابیات کے زیرِ عنوان درج ہیں، تاریخ کی کچھ اور ہی کہانی سناتی ہیں۔ تاریخ کی یہ دوسری کہانی خاکہ تو وہی پیش کرتی ہے جو پہلی کہانی کا ہے، مگر اس میں رنگ بہت مختلف بھرتی ہے۔ یہ رنگ گو کہ نصابی کہانی جیسے شوخ و چنچل تو نہیں، مگر ہمارے حال سے بہت ملتے جلتے ہیں۔

تاریخ کی اس کہانی کو مان لیا جائے تو اپنا حال پر ایسا نہیں لگتا بلکہ حال کے تانے بانے ماضی سے ملنے لگتے ہیں۔ سمجھ میں آنے لگتا ہے کہ آج ہم جن حالات کا شکار ہیں وہ کیوں اور کیسے تشکیل پائے؟ ان حالات کو بدلنے کے کچھ راستے بھی سجھائی دینے لگتے ہیں۔

مگر سوال یہ ہے کہ تاریخ کی کونسی کہانی صیح ہے، رنگین یا بدرنگ؟ یہی وہ سوال ہے جس کا جواب تلاش کرنے کی جستجو قاری میں پیدا کرنا اس کتاب کا مقصد ہے۔

اس کتاب میں ایک مکمل اور مسلسل تاریخ کا بیان نہیں بلکہ ہماری تاریخ کے چند ادوار کے خاکے سے پیش کئے گئے ہیں۔ خاکے بھی مختصر اور ہلکے پھلکے رکھے گئے ہیں تاکہ پڑھنے والے کو دقیق محسوس نہ ہوں اور ہر قسم کا قاری آسانی سے ان کا مطالعہ کر سکے۔ امید ہے کہ یہ خاکے قاری میں تاریخ کی کڑوی سچائیوں کو کھوج نکالنے کی وہ تڑپ بیدار کر پائیں گے جو آہستہ آہستہ معدوم ہوتی جا رہی ہے اور جس کہ بارے میں میر نے کہا ہے ؎

بار بار اس کے در پہ جاتا ہوں
حالت اب اضطراب کی سی ہے

مخدوم ٹیپو سلمان

نومبر 2016ء

blog : tsmthinkingloud.blogspot.com
email: lawpakistan123@gmail.com

پہلا باب

تاریخ، حقائق اور کہانی

سب سے پہلے جب انسان کو تاریخ کا شعور ہوا تو اُس نے ماضی یاد رکھنا اور اپنی اگلی نسلوں کو پہنچانا شروع کیا۔ تاریخ کو محفوظ رکھنے کا پہلا طریقہ جو انسان نے اپنایا وہ شاعری تھا۔ نظموں میں تاریخ بیان کرنے کا سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ ایک طرف تو حقائق کو بڑھا چڑھا کر رومانوی بنایا جاسکتا تھا اور دوسرے شاعری کو یاد رکھنا آسان تھا۔ یہ اُن زمانوں کی بات ہے جب ابھی لکھائی ایجاد نہیں ہوئی تھی۔

جب لکھائی ایجاد ہو گئی تو ماضی کی کہانیاں نثر میں بھی لکھی جانے لگیں۔ مگر چونکہ لکھائی ابھی دربار تک ہی محدود تھی، اِس لئے لکھی جانے والی تاریخ درباری تاریخ بن گئی جبکہ عام عوام نے اپنا ماضی شاعری میں ہی بیان کرنا جاری رکھا۔ اس طرح درباری اور عوامی تاریخ کا ٹکراؤ شروع ہوا۔ درباری تاریخ بادشاہوں اور جنگوں کی کہانیاں بیان کرنے لگی اور عوامی تاریخ عوام کی۔

آہستہ آہستہ جب لکھائی عام ہو گئی تو عوامی تاریخ بھی لوک گیتوں سے نکل کر کتابوں میں مقید ہونے لگی۔ چونکہ دربار کے پاس دولت اور طاقت ہوا کرتی تھی، اس لئے درباری تواریخ کا پلّا بھاری رہا۔ چنانچہ صدیوں تک تاریخ کی کتابوں میں بادشاہ

اور جنگیں حاوی رہے۔ بیسویں صدی میں یہ شعور عام ہونے لگا کہ قوم کی تاریخ اُس کے حکمرانوں کی کہانی نہیں، بلکہ اُس کے عوام کی کہانی ہوتی ہے۔ اِس طرح تاریخ میں بادشاہوں کے ساتھ ساتھ معیشت، ثقافت، علم، فن اور ادب وغیرہ کی کہانیاں بھی شامل ہونے لگیں۔

پچھلی کئی صدیوں سے تاریخ دانوں نے تاریخ میں سے رومانوی کہانیوں اور حقائق کو علیحدہ علیحدہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ جب حقائق پرکھ لئے گئے تو یہ بحث شروع ہوئی کہ آیا تاریخ دان کا کام محض حقائق اکٹھا کرنا ہی ہے یا اُنہیں آپس میں جوڑ کر اور اُن کی تشریح کر کے ماضی کی کہانی بیان کرنا بھی؟ اِس طرح تاریخ ایک بار پھر ماضی کی کہانی کے طور پر ہمارے سامنے آنے لگی، مگر اِس بار یہ کہانی حقائق پر مبنی تھی۔

تاریخی حقائق سیدھے سادھے نہیں ہوتے۔ تاریخ دان کو ماضی کے جھروکوں میں جھانک کر گزرے زمانوں کی نبض پکڑنی ہوتی ہے۔ تاریخ کی کہانی بیان کرنے کے لئے تاریخ دان کو تاریخی قوتوں اور تاریخی ساختوں کو سمجھ کر حقائق کو اُن کے تناظر میں رکھنا ہوتا ہے۔ گزرے وقتوں کے قبرستانوں میں دفن کہانیاں اکھاڑ اکھاڑ کر پڑھنے کے لئے تاریخ دان کو کیا ہوا تھا؟ کس طرح ہوا تھا؟ کن وجوہات کی بنا پر ہوا تھا؟ کن حالات میں ہوا تھا؟ جیسے بے شمار سوال اٹھانے اور ان کے جوابات تلاش کرنے ہوتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ تاریخ ایک پردیس ہے جس کے باسی ہم سے بہت مختلف ہوتے ہیں۔ تاریخ دانوں میں یہ کہاوت اِس لئے مشہور ہے کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ آج کے نقطہ ٔ نظر سے تاریخی واقعات کو دیکھنے اور پرکھنے سے ہم کبھی بھی تاریخ کی

اصلیت کو نہیں پاسکتے۔ اگر ہم سمجھتے ہیں کہ پچھلی نسلوں کے لوگ اپنے حالات کو اُسی طرح دیکھتے تھے جیسے آج ہم اُن کے حالات کو دیکھ رہے ہیں، تو یہ اپنے آپ کو دھوکا دینے کے مترادف ہے۔

اپنے مضموم عزائم کی تکمیل کے لئے مختلف طبقات کا تاریخ کو توڑنا مروڑنا ایک عام امر رہا ہے۔ مگر پچھلی نصف صدی میں تاریخ دانوں نے ایسے بہت سے سائنسی اصول وضع کئے ہیں جن سے تاریخ اور دیومالائی داستانوں میں فرق رکھا جا سکے۔ ان میں سے ایک اہم اصول یہ ہے کہ تاریخ کی کوئی بھی کہانی بیان کرتے ہوئے اُن تمام حقائق کو سامنے رکھ کر بات کی جائے جو میسر ہیں، نہ کہ صرف اُن حقائق پر بات کی جائے جو آپ کی کہانی سے مطابقت رکھتے ہیں۔ ماضی میں ہم دیکھتے آئے ہیں کہ ہر طبقہ اور ہر ریاست، یہاں تک کہ کئی حکومتیں بھی، اپنی مرضی کی نئی نئی تاریخیں بنا کر پیش کیا کرتی تھیں۔ ایسی ہر تاریخ سے وہی نتیجے نکلتے دکھائی دیتے تھے جو وہ طبقہ یا ریاست چاہتے تھے۔ ایسا کرنے کے دو ہی خاص اوزار ہوا کرتے تھے۔ ایک یہ کہ جھوٹ کے پلندے کو حقائق کہہ کر لکھ دیا جائے، اور دوسرا یہ کہ صرف وہی حقائق بیان کئے جائیں جو آپ کی داستان کو سہارا دیتے ہوں۔ باقی حقائق کا سرے سے ذکر ہی نہ کیا جائے۔ ایسی دیومالائی تاریخ سے بچنے کا واحد طریقہ یہی ہے کہ تمام کے تمام اہم حقائق سامنے رکھ کر تاریخ دان تاریخ کی کہانی بیان کرے۔ جو کہانی تمام حقائق کو ساتھ لے کر نہ چل سکے، وہ تاریخی نہیں، دیومالائی کہانی ہے۔

پھر حقائق اور تاریخی حقائق میں بھی فرق ہوتا ہے کہ صرف تاریخی حقائق ہی تاریخ کا حصّہ بنتے ہیں، اور پھر مل کر تاریخ بناتے ہیں جبکہ غیر تاریخی حقائق کو تاریخ

نظر انداز کر دیا کرتی ہے۔ مگر یہ فیصلہ کہ کونسی حقیقت تاریخی اہمیت کی حامل ہے اور اسے تاریخی حقائق کی فہرست میں شامل کر کے تاریخ کا حصّہ بننا چاہیے، مکمل طور پر تاریخ دانوں پر منحصر ہوتا ہے۔ صرف وہی واقعات تاریخ کا حصّہ بنتے ہیں جنہیں تاریخ دان اِس قابل سمجھتے ہیں کہ انہیں تاریخ کا حصّہ بنانے کے لئے درج کرنا ضروری ہے۔ جو واقعات درج نہیں کئے جاتے اور بھُلا دیے جاتے ہیں۔ وہ نہ تاریخ بنتے ہیں اور نہ ہی تاریخ بناتے ہیں۔ اُنیسویں صدی میں دنیا بھر کے تاریخ دان اس بات پر متفق نظر آتے تھے کہ تاریخ دان کا اصل کام پرانے وقتوں میں وقوع پذیر واقعات سے متعلق اصل حقائق کا کھوج کر کے اُنہیں اکٹھا کرنا اور پھر اِس کی ایک مربوط کہانی بیان کرنا ہے۔ اِس بات پر تقریباً سب متحد ہیں کہ اس طرح سے اکٹھے کئے گئے حقائق پر ہی تاریخ کی اصل کہانی کی بنیاد رکھی جاسکتی ہے۔ اِس نظریے میں گو کہ بڑی حد تک صداقت بھی ہے مگر اس زاویے سے ایک تاریخ دان کا سب سے اہم فیصلہ یہ ہو جاتا ہے کہ کونسی حقیقت تاریخی اہمیت کی حامل ہے اور کونسی نہیں؟ یعنی کوئی بھی تاریخ مرتب کرتے ہوئے حقائق کی چھانٹ پھٹک کلیدی کردار ادا کرتی ہے۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ یہ فیصلے کہ کونسے حقائق کسی تاریخ میں شامل کرنے ہیں یا نہیں، بذاتِ خود تاریخ کی کہانی پر بے انتہا اثر انداز ہوتے ہیں۔

مثلاً ایک تاریخ کی کتاب جو احمد شاہ ابدالی کے صرف اُس حملے کا ذکر کرے گی جو اُس نے شاہ ولی اللہ کی دعوت پر کیا اور جس میں اُس نے پانی پت کی تیسری جنگ میں مرہٹوں کو شکست دی، وہ کچھ بھی اور کہے بِنا احمد شاہ ابدالی کو اسلام، مغلیہ سلطنت اور ہندوستان کے لئے رحمت ثابت کرے گی۔ دوسری طرف تاریخ کی وہ کتاب جو احمد

شاہ ابدالی کے ہندوستان کے تمام دس حملوں اور اُس کی یہاں کی گئی لوٹ مار اور قتل و غارت کے حقائق بھی بیان کرے گی، وہ ابدالی کا کردار پہلی کتاب سے خاصا مختلف پیش کرے گی۔

اگر کسی علاقے، زمانے یا واقعہ کے بارے میں ایک ہی نقطہء نظر کی کسوٹی پر جانچ کر حقائق درج کئے جاتے رہیں تو کچھ ہی عرصے میں اُس علاقے، زمانے یا واقعہ کی اصل تاریخ ماضی کے اندھیروں میں گُم ہو جائے گی اور ایک نقطہء نظر کا عقیدہ تاریخ کے نام پر باقی رہ جائے گا۔

☆☆......☆☆

دوسرا باب

ہڑپہ سے گندھارا

(8000)ق۔م سے (500) عیسوی

تہذیب

تمام قدیم تہذیبیں دریائوں کے کنارے ہی پروان چڑھتی تھیں کیونکہ زراعت کے لئے پانی دریائوں سے دُور لانے والا نہری نظام بنانے کی سکت اور تکنیک انسان کے پاس نہ تھی اور نہ ہی اُس وقت وہ زمین کی گہرائیوں سے پانی کھینچ لانے کی استطاعت رکھتا تھا۔ چنانچہ عراق کی بابل و نینوا کی تہذیب دریائے دجلہ اور دریائے فرات کی وادی میں پروان چڑھی، مصر کی فرعونی تہذیب دریائے نیل کی وادیٔ اور چین کی شینگ تہذیب نے دریائے زرد کی وادیوں میں نشوونما پائی۔ اسی طرح ہڑپہ کی تہذیب، جسے وادیٔ سندھ یا مہنجوڈرو کی تہذیب بھی کہا جاتا ہے، نے دریائے سندھ کی وادی میں جنم لیا۔

لیکن صرف وافر پانی سے مسئلہ حل نہ ہوا کرتا تھا کیونکہ کسی بھی معاشرے میں تمام لوگ کھیتی باڑی نہ کرسکتے تھے۔ کچھ بوڑھے ہوتے تھے کچھ بچے ۔ عورتوں نے گھر اور بچوں کی دیکھ بھال کرنا ہوتی تھی۔ پھر معاشرے میں اور بہت سے کام ہوتے

تھے جن کو کرنے والے لوگ کھیتی باڑی نہ کر سکتے تھے، یا نہ کرتے تھے۔ مثلاً پروہت، جنگجو، کاریگر، حکومتی اہلکار وغیرہ۔ لہٰذا تہذیب اُس وقت پروان چڑھا کرتی تھی جب قدیم معاشرہ ایسی تکنیک ایجاد کرتا جس سے کم کسان زیادہ غلہ اُگا پاتے اور معاشرہ کے بچوں، بوڑھوں، جنگجوئوں، حکومتی اہلکاروں، کاریگروں اور پروہتوں وغیرہ کو بھی پال سکتے۔

کوئی بھی تہذیب عظمت کی بلندیوں کو تب تک نہ چھو سکتی ہے جب تک وہ دوسری تہذیبوں سے رابطے میں نہ رہے۔ دوسری تہذیبوں سے رابطے کا یہ فائدہ ہوتا ہے کہ ایک تہذیب کے دانشوروں، عالموں اور کاریگروں نے جو جدت حاصل کی ہوتی ہے وہ دوسری تہذیب کے عالم سیکھ لیتے ہیں جبکہ اپنی تعلیمات وہ دوسروں کو سِکھا دیتے ہیں۔ اس طرح کم وقت اور کم محنت کے ساتھ دونوں تہذیبیں زیادہ ترقی کر لیتی ہیں۔

ہڑپہ

پاکستان میں انسان تقریباً پانچ لاکھ سال سے آباد ہیں۔ اُس زمانے میں انسان غاروں میں رہا کرتے تھے اور پتھر کے اوزاروں سے جانوروں کا شکار کر کے اور پھل وغیرہ کھا کر گزارہ کیا کرتے تھے۔ دیکھا جائے تو اُس زمانے کے انسان اور جانور میں کوئی بہت نمایاں فرق نہ تھا۔

ہندوستان میں مختلف قدیمی تہذیبوں نے جنم لیا جن میں ہڑپہ اور وادی گنگا کی تہذیبیں شامل ہیں۔ ہڑپہ کی تہذیب پاک وہند کی قدیم ترین تہذیب ہے۔

ہڑپہ کی تہذیب چونکہ دریائے سندھ کی وادی میں پروان چڑھی، اِس لئے یہ

پاکستان کے تقریباً تمام علاقے پر محیط تھی جبکہ وادیٔ گنگا کی تہذیب موجودہ ہندوستانی علاقے میں پروان چڑھی۔ یہ بات البتہ قابلِ ذکر ہے کہ وادی گنگا کی تہذیب کا زمانہ ہڑپہ کی تہذیب سے ہزاروں سال بعد کا ہے۔

ہڑپہ کی تہذیب یہاں کے مقامی لوگوں یعنی دراوڑ نسل کی پیداوار تھی جبکہ وادی گنگا کی ویدک تہذیب کی پرورش میں وسطی ایشیا سے آنے والے آریا نسل کے حملہ آوروں کا بڑا حصہ تھا۔

ہڑپہ کی تہذیب اتنی پرانی ہے کہ یہ پاک وہند کی پہچان ہے۔ یہاں تک کہ ہندوستان کے تین نام بھارت، ہندوستان اور انڈیا وادیٔ سندھ کے مرہون منت ہیں۔

جب آریا نسل کے لوگ وسط ایشیائی برفانی علاقوں سے وادی سندھ اور دیگر ہندوستان پر حملہ آور ہوئے اور فاتح ہوئے تو انہوں نے اپنے اوتار بھرت کے نام پر اس ملک کا نام بھارت رکھا۔

سنسکرت زبان میں دریا کو سندھو کہتے ہیں، جس کی وجہ سے دریائے سندھ کا نام بھی سندھ ہے۔ اسی لفظ کی نسبت سے یہ علاقہ سندھو دیش کہلایا۔ قدیم ایرانی سندھو دیش کو ہندو دیش بولتے اور یہاں سے اس کا نام ہندوستان پڑ گیا۔ پھر جب سکندر کے ساتھ یونانی یہاں آئے تو وہ ہندو کو انڈوس بولے جو بعد میں انڈیا ہو گیا۔

دنیا کے مختلف علاقوں میں بسنے والے انسان مختلف نسل کے انسان تصور کئے جاتے ہیں۔ ایک نسل کے انسان وہ لوگ سمجھے جاتے ہیں جن میں کوئی ایسی جسمانی خوبی ہو جو دوسری نسل میں نہ پائی جاتی ہو اور یہ خوبی موروثی بھی ہو یعنی والدین سے بچوں میں منتقل ہوتی ہو۔ جیسے کہ ہم لوگ عام طور پر جلد کے رنگ کو نسل کا مظہر سمجھتے

ہیں۔ مثلاً گورے یورپی یا کالے افریقی مختلف النسل ہیں۔ جبکہ جاپانی لوگ بدن پر بال ہونے یا نہ ہونے کو نسل کی پہچان جانتے ہیں کیونکہ جاپانی لوگوں کے جسموں پر بال نہیں ہوتے چنانچہ وہ بالوں والے لوگوں کو وحشی اور کمتر جانتے ہیں۔

کالی رنگت، موٹے ہونٹ، گھنگھریالے سیاہ بال اور چپٹی ناک۔ یہ وہ خواص ہیں جو ہمارے پُرکھوں کی نسل کے نمائندہ تھے۔ یہی وہ لوگ تھے جو آج سے دس ہزار سال پہلے کی ہڑپہ کی تہذیب کے معمار تھے۔ آج ہم اپنے دراوڑی (Dravidian) پُرکھوں سے اس لئے مختلف نظر آتے ہیں کہ ان میں وقت کے ساتھ ساتھ وسط ایشیا کے برفانی علاقوں کے سفید فام آریا نسل اور تپتے صحرائوں کے سامی نسل کے عربوں سمیت کئی اور نسلوں کا خون شامل ہو چکا ہے۔

ہم اس نسل کے لوگ ہیں جو ہزاروں سالوں سے اس سرزمین پر بستی ہے اور دنیا کی ایک قدیم ترین تہذیب کی بانی ہے۔ مگر اپنے ماضی پر فخر کرنے اور اپنے آباء کی طرح کچھ انوکھا کرنے کے بجائے ہم دن رات اس کوشش میں رہتے ہیں کہ اپنی ثقافت کو ہندو مذہب سے نتھی کرکے اس کے ساتھ اپنے تعلق کا انکار کرتے رہیں اور اس کی جگہ زبردستی اپنے آپ کو سامی نسل کے عربوں سے ملانے کی کوشش کرتے رہیں یا سفید فام آریائوں یا ایسی دوسری نسلوں سے بلاوجہ مرعوب ہوتے رہیں۔

ترقی

قصہ کچھ یوں ہے کہ زراعت کا آغاز فلسطین کے علاقے میں تقریباً پندرہ ہزار سال قبل ہوا۔ یہاں سے انسان دریاہائے دجلہ و فرات کی وادیوں میں جا بسا جہاں پر آج سے پانچ ہزار سال قبل اُس نے بابل و نینوا کی تہذیب کی بنیاد رکھی۔ کچھ ہی

صدیوں کے بعد یہ تہذیبی ترقی مصر تک جا پہنچی جہاں فرعونوں نے مصری تہذیب کی بنیاد رکھی۔ ان عربی و افریقی تہذیبوں کے آغاز سے کچھ پانچ ہزار سال قبل وادی سندھ میں ہمارے اجداد موجودہ بلوچستان کے علاقے مہر گڑھ سے ہڑپہ کی تہذیب کا آغاز کر چکے تھے۔ ماہرین کا خیال ہے کہ جس وقت مصر میں تہذیب جنم لے رہی تھی اور فرعون اپنا پہلا اہرام تعمیر کروا رہے تھے اُن دنوں ہڑپہ صدیوں کی ترقی پر محیط اپنے تہذیبی عروج کی طرف گامزن تھی۔

گویا کہ آج سے پانچ ہزار سال قبل اہرامِ مصر تعمیر کئے گئے جبکہ اہرامِ مصر سے بھی پانچ ہزار سال پہلے ہڑپہ کے لوگوں نے تہذیب کی داغ بیل ڈال دی تھی۔

یہ شروعات اسلام آباد کے قریب وادئ سون میں ہوئی جہاں دنیا کا سب سے پہلا پتھر کا ہتھیار بنا اور زبان کی ابتداء ہوئی۔ یہاں سے ترقی منزلیں مارتی ہوئی بولان پاس کے قریب مہر گڑھ سے ہوتی ہوئی سندھ میں موہنجو داڑو اور پنجاب میں ہڑپہ پر منتج ہوئی۔

پاکستان کے علاقے میں انسان آج سے دس ہزار سال پہلے بھی گھروں میں رہتے اور کھیتی باڑی کرتے تھے۔ اُس زمانے میں جب دنیا کے زیادہ تر علاقوں بشمول یورپ اور امریکہ میں لوگ غاروں میں رہا کرتے اور جانوروں کی سی زندگی گزارتے تھے ہمارے آبائو اجداد بلوچستان کے علاقے مہر گڑھ اور گردونواح میں اونی لباس پہن کر سر کنڈوں سے ٹوکریاں بنانے کا فن سیکھ چکے تھے۔ یہاں تک کہ مٹی سے برتن بنا کر اُنہیں آگ میں پکا کر مضبوط بھی کر لیا کرتے تھے۔ یہ سب سائنس اور آرٹ کی جدت ہمارے اجداد مصری تہذیب کے آغاز سے بھی پانچ ہزار سال پہلے حاصل کر

چکے تھے۔

وادیٔ سندھ کی مصنوعات دور دور تک مشہور تھیں۔ خاص طور پر بابل و نینوا کی عراقی تہذیب میں ان کی بہت مانگ تھی۔ عراقی تہذیب میں وادی سندھ ''میلوہا'' کے نام سے جانی جاتی تھی۔ اسی لفظ سے ایک طرف لفظ ''ملیکھا'' نکلا جو بعد میں ''ملیچھا'' اور پھر ''ملیچھ'' بن گیا جسے یہاں بعد میں آنے والے آریالوگوں نے مقامی دراوڑوں کے لئے استعمال کیا اور یوں یہ حقارت یا پنچ لوگوں کے لئے استعمال ہوا۔

دوسری طرف اسی لفظ ''میلوہا'' سے لفظ ''ملح'' یعنی کشتی چلانے والا بنا جس سے بعد میں لفظ ''موہن'' بنا۔ اسی موہن سے لفظ موہنجوڈرو بنا۔ ''موہن۔جو۔ڈرو'' یعنی کہ موہن لوگوں کی پہاڑی۔

ہڑپہ کے زیادہ تر آثار تو دریافت سے پہلے ہی تباہ ہو چکے تھے جب انگریز سرکار نے بیسویں صدی کے آغاز میں لاہور سے ملتان ریلوے لائن بچھانے کا منصوبہ بنایا۔ ریل کی پٹریوں میں اینٹوں کے روڑے کُوٹ کر ڈالے جاتے ہیں۔ ساہیوال کے علاقے میں ٹھیکے دار نے دیکھا کہ مٹی کی ایک پست قامت مگر میلوں پر پھیلی ہوئی پہاڑی ہے جس کو ذرا سا ہی کھودا جائے تو مفت کی اینٹیں نکلتی ہیں۔ اس پہاڑی کے نیچے دراصل ہڑپہ شہر کے کھنڈرات تھے جو انجانے میں ٹھیکے دار نے سارے کھود کھود کر ریلوے لائن میں بچھا دیئے۔ یہی وجہ ہے کہ ہڑپہ کے شہر میں کوئی بھی عمارت ثابت نہ ملی، صرف عمارات کی بنیادیں ملیں۔

دوسری طرف موہنجوڈرو کا شہر پورا کا پورا ثابت مل گیا۔ مگر ایک تو ابھی تک اس کے تمام حصوں کی کھدائی مکمل نہیں ہو سکی اور دوسرے زیر آب پانی کی سطح نے

آثارِ قدیمہ کے اس بیش بہا خزانے کو بھی تباہ کرنا شروع کر دیا ہے۔

رگ ویدوں کی حمدوں کے مطابق آریا دیوتائوں نے وسط ایشیائی برفانی علاقوں کے لمبے تڑنگے، گورے چٹے اور وحشی جنگجو آریا قبائل کو وادیٔ سندھ کے لوگوں پر فتح عطا کی جن کو ان وحشیوں نے غلام بنا کر شودر کا نام دیا۔

مگر ماہرین کا خیال ہے کہ ہڑپہ تہذیب کے زوال اور تباہی کی بڑی وجوہات میں موسم کی تبدیلی، دریائوں کا راستہ بدلنا اور پانی کی کمی بھی شامل تھی۔

وادیٔ سندھ کی تہذیب اپنی ہم عصر مصری و عراقی تہذیبوں سے دُگنی بڑی تھی۔ یہ پانچ لاکھ مربع میل کے وسیع علاقے پر پھیلی ہوئی ستر اہم شہروں پر مشتمل تہذیب تھی۔ یہ پاکستان کے چاروں صوبوں کے علاوہ عمان، افغانستان اور گجرات کاٹھیاواڑ تک محیط تھی۔ اس کے سب سے مشہور شہر پنجاب میں واقعہ ہڑپہ اور سندھ میں واقع موہنجوڈرو تھے جو چالیس ہزار نفوس کی آبادی پر مشتمل تھے اور 3 میل کے وسیع علاقے پر پھیلے اپنے وقت کے شاید دنیا کے سب سے بڑے شہر تھے۔

ان شہروں میں ہر بڑی سڑک کے کنارے پولیس کی چیک پوسٹیں تھیں جن کا مقصد شہریوں کی جان و مال کی حفاظت تھا۔

باوجود اس امر کے کہ اُس زمانے میں ایک سو میل کا فاصلہ طے کرنے میں ہفتوں اور مہینوں لگ جایا کرتے تھے کیونکہ گھوڑا ابھی سدھایا نہ گیا تھا، پانچ لاکھ مربع میل کے وسیع علاقے میں پھیلی اس تہذیب کے تمام خطوط یکساں تھے۔ یہاں تک کہ اینٹوں کی بناوٹ، گلیوں کے سائز اور وزن کے باٹ تمام جگہوں پر بالکل ایک سے استعمال ہوا کرتے تھے۔ تاریخ دان حیران ہیں کہ اُس قدیم زمانے میں یہ کیونکر ممکن

ہو سکا۔ یہ سب ہڑپہ کی تہذیب اور اُس کے باسیوں یعنی ہمارے پُرکھوں کی علم و حکمت کی داستانیں ہیں۔

ہماری تہذیب کی اُٹھان کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اُس زمانے میں تمام بڑے شہر باقاعدہ نقشے کے تحت تعمیر کئے گئے تھے۔ تمام شہر ایک ہی طرز کے مختلف حصوں میں بٹے تھے۔

شہر کی تمام شاہراہیں ایک ہی ناپ کی اور بالکل سیدھی تھیں۔ ہر بڑے گھر میں غسل خانہ ہوا کرتا تھا۔ گندے پانی کے نکاس کے لئے ہر گھر سے نالیاں نکلتی تھیں جو کہ ڈھکی ہوئی ہوا کرتی تھیں اور سڑکوں کے کنارے چلتی ہوئی مرکزی گٹر میں جا گرتی تھیں۔

کہا جاتا ہے کہ پہیے والی گاڑی بھی اسی تہذیب نے ایجاد کی کیونکہ دنیا کا سب سے پرانا بیل گاڑی کھلونا یہیں سے ملا ہے۔

وادیٔ سندھ میں مٹی اور تانبے کے علاوہ بھی کئی دھاتوں سے عمدہ برتن، زیورات، اوزار اور ہتھیار تیار کئے جاتے تھے۔ ہماری تہذیب نے کپاس سے دھاگا اور اُس دھاگے سے کپڑا بنانے کا فن ایجاد کیا۔ یہ کپڑا رنگ کر عراق تک برآمد کیا جاتا تھا۔

ہڑپہ کی تہذیب نے خود سے اپنی ایک اعلیٰ تحریری زبان بھی ایجاد کر رکھی تھی مگر یہ زبان آج تک پڑھی نہیں جاسکی جس کی وجہ سے اس تہذیب کے بہت سے رازوں سے ابھی تک پردہ نہیں اُٹھ سکا۔ یہ زبان دنیا کی تمام زبانوں سے ہر طرح سے منفرد اور انوکھی ہے۔ یہاں تک کہ یہ لکھی بھی مسلسل جاتی تھی۔ یعنی پہلی سطر دائیں سے بائیں، دوسری سطر بائیں سے دائیں اور تیسری سطر پھر دائیں سے بائیں۔

ہڑپہ کی تہذیب کی تمام عمارتیں ایک ہی ترکیب اور ایک ہی تناسب کے ناپ کی اینٹوں سے تعمیر کی گئی ہیں۔ یہاں کے مکانات تہذیب یافتہ زندگی کا عمدہ نمونہ ہیں۔ یہ گھر دو منزلہ تھے جن میں تمام کمرے ایک صحن کے گرد بنائے جاتے تھے۔ کمروں کو ہوادار رکھنے کے لئے ان میں کھڑکیاں بھی رکھی جاتی تھیں۔

شہر مختلف قسم کے رہائشی علاقوں میں بٹے ہوئے تھے۔ نشیبی علاقوں میں چھوٹے چھوٹے گھر ہوا کرتے تھے جن میں غریب عوام رہا کرتی تھی جبکہ اونچے علاقوں میں بڑے بڑے گھر تھے جن میں امراء رہائش پذیر تھے۔ ان گھروں میں ملازموں کی رہائش کے لئے سرونٹ کوارٹرز بھی ہوا کرتے تھے۔

مرد اور عورتیں سنگھار کے لئے انواع واقسام کے زیورات استعمال کرتے تھے اور چہرے کو دلکش بنانے کے لئے غازہ اور سرمے کا بھی استعمال کرتے تھے۔ کھیلوں میں ذہنی ورزش کے کھیل بھی شامل تھے اور ایک طرح کی شطرنج بھی کھیلی جاتی تھی۔

بچوں سے بہت محبت کی جاتی تھی اور ان کے لئے کئی قسم کے کھلونے تیار کئے جاتے تھے۔

کھیتی باڑی کے لئے جانور اور مال برداری کے لئے دو پہیوں اور چار پہیوں والی بیل گاڑی اور کشتی کا استعمال عام تھا۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ جب وادیٔ سندھ میں لوگ بڑے بڑے شہر بسا رہے تھے اور علم و فن کی عظیم تہذیب کو ترقی دے رہے تھے اُس وقت باقی ہندوستان میں تہذیب کا نام ونشان نہ تھا اور لوگ چھوٹے چھوٹے جنگلی قبیلوں کی شکل میں رہتے

تھے۔

ہمارے آباؤ اجداد پُر مغز اور پُر امن لوگ تھے۔ وادئ سندھ کی تہذیب میں جنگ و جدل، لوٹ مار اور قتل و غارت گری کی کوئی یادگاریں نہ ملی ہیں۔

عمان

ہڑپہ کی تہذیب سلطنتِ عمان تک پھیلی ہوئی تھی۔ پاکستان اور عمان کے درمیان بحرِ عرب حائل ہے اور یہ واحد علاقہ ہے جو پاکستان کے ساتھ جڑا ہوا نہیں اور پھر بھی وادئ سندھ کی تہذیب کا حصہ رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری تانبے کی مصنوعات کی عراقی تہذیب میں بڑی مانگ تھی اور عمان میں تانبے کے بے شمار ذخائر تھے۔ سمندر پار کا علاقہ عمان، جو کہ بلوچستان کے گوادر کے ساحل سے کوئی تین سو میل کے فاصلے پر واقعہ ہے اس تہذیب کا حصہ بن گیا تھا۔

سلطنتِ عمان سے ہمارا رشتہ ہڑپہ کی تہذیب کے زمانے سے 1958ء تک رہا جب تک گوادر عمان کا حصہ تھا۔

گوادر، جو کراچی سے کوئی پانچ سو میل جبکہ ایران سے محض ایک سو میل دور ہے، ہڑپہ کی تہذیب کے تباہ ہونے کے بعد ایران کے عظیم شہنشاہ سائرسِ اعظم اور بعد میں سکندرِ اعظم کے جرنیلوں کے زیرِ حکومت رہا۔ سائرس کے زمانے میں ایرانی اس علاقے کو مچھلی کھانے والوں کا علاقہ یعنی "ماہی خوراں" کہا کرتے تھے جس سے مکران کا نام ماخوذ ہے۔

303 قبل مسیح میں بلوچی لوگوں نے مکران / گوادر کا علاقہ یونانیوں سے واپس حاصل کر لیا۔

مکران کا علاقہ، جو کہ گوادر سے ملحقہ ہے، حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں سنہ 643 عیسوی میں مسلمان عرب فوج نے فتح کر لیا اور تقریباً دو سو سال تک یہ عربوں کے زیرِ تسلط رہا جس کے بعد بلوچیوں نے اسے دوبارہ فتح کر لیا۔ سلطنتِ امیہ کے اکثر باغی مکران کے علاقے میں آ کر چھپ جایا کرتے تھے۔ ایسا ہی ایک باغی الافی اور اُس کا گروہ تھا جو بعد میں سندھ / دیبل کے راجہ داہر کی فوج میں شامل ہو گیا تھا۔ جب امیہ گورنر / جرنیل حجاج بن یوسف نے 712 عیسوی میں اپنا کمانڈر محمد بن قاسم دیبل پر حملہ کے لئے بھیجا تو الافی اور اُس کا گروہ راجہ داہر کی فوج کا حصہ تھے۔

1783ء میں مکران / گوادر پر خان قلات کی حکومت تھی۔ اُس وقت عمان کے سلطان تیمور کو اس کے بھائی نے بے دخل کر دیا۔ سلطان بھاگ کر بلوچستان آ گیا اور خان قلات سے مدد مانگی۔ خان نے مکران / گوادر کا علاقہ عمان کے سلطان کو عارضی طور پر دے دیا کہ وہ یہاں حکومت کرے، ٹیکس کے ذریعے خزانہ جمع کرے ۔ فوج تیار کرے اور عمان کی سلطنت دوبارہ حاصل کرنے کے بعد مکران / گوادر خان قلات کو واپس کر دے۔ مگر جب سلطان نے عمان کی حکومت دوبارہ حاصل کر لی تو مکران اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ اس بات پر بلوچیوں اور سلطنت عمان میں چپقلش رہی۔ آخر کار انگریزوں نے سلطانِ عمان سے رعایتیں حاصل کر کے مکران / گوادر عمان کو دے دیا۔

1958ء میں حکومت پاکستان نے مکران / گوادر کا علاقہ حکومت عمان سے ساڑھے پانچ ارب روپے میں خریدا۔ صوبہ بلوچستان کا حصہ مکران بہرحال 1977ء میں بنایا گیا۔

مذہب

ہڑپہ کی تہذیب میں ہمارے بزرگوں کے مذہبی عقائد کے بارے میں پوری معلومات ابھی تک حاصل نہیں ہو سکیں۔ اُس کی ایک وجہ یہ ہے کہ موہنجوڈرو میں جو عبادت گاہ تھی اُس کے اوپر بعد کے زمانوں میں ایک بدھ سٹوپا تعمیر کر دیا گیا تھا۔ اس سٹوپے کو ہٹا کر کھدائی کرنے کا فیصلہ اب تک کوئی نہ کر سکا ہے۔ دوسری طرف ہڑپہ کے قدیم شہر میں جس جگہ عبادت گاہ تھی وہاں آج کے شہریوں نے اپنا قبرستان بنا رکھا ہے۔ لہٰذا وہاں پر کھدائی کرنے پر کفر کے فتوے لگ جانے کا اندیشہ ہے۔

تاریخ دانوں کے اندازے کے مطابق حضرت ابراہیمؑ سے تقریباً ایک ہزار سال قبل ہڑپہ کی تہذیب میں اوسط عمر تیس سال تھی اور ہمارے آبا ؤ اجداد اپنے مُردوں کو بڑے اہتمام سے قبروں میں دفنایا کرتے تھے۔ مُردے کا چہرہ آسمان کی طرف اور سر شمال کی جانب رکھا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ مُردے کے ساتھ قبر میں ضرورت کی مختلف اشیاء بھی دفنائی جاتی تھیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حیات بعد از موت کے عقائد رائج العام تھے۔

وادیٔ سندھ میں بادشاہت نہیں تھی۔ شاہی نظام کو مذہبی نظام نے پنپنے ہی نہ دیا تھا۔ وادیٔ سندھ میں پروہت ہی طاقت کا اصل سرچشمہ تھے۔ پوری تہذیب مذہبی علماء کے تابع تھی۔ جب ہماری تہذیب پروان چڑھ رہی تھی تو بہت اعلیٰ، علمی اور جدید تھی۔ جب کافی ترقی ہو چکی اور دولت کی فراوانی بھی ہو گئی تو اس سے پہلے کہ بادشاہت تمام دولت پر قبضہ کر لیتی، مذہبی جماعت نے حاکمیت پر قبضہ کر لیا۔

ہم ازل سے ایک نیک اور امن پسند قوم ہیں۔ مذہبی پروہتوں نے ہماری نیکی

کا فائدہ اُٹھایا اور ہمارے بزرگوں کو دیوتاؤں کی خواہشات، اُن کی خوشی اور ناراضگی اور حیات بعد از موت کے جھمیلوں میں ایسا اُلجھایا کہ ساری قوم دیوتاؤں کی خوشی کے چکر میں اپنی جدت اور ترقی تیاگ کر سب کچھ تباہ کر بیٹھی۔

مذہبی پنڈتوں نے ایسا جال بچھایا کہ کسی بھی قسم کی طاقت استعمال کئے بغیر ساری قوم دیوتاؤں کو چڑھاوئوں کے نام پر بے شمار دولت ان پروہتوں کے حوالے کر دیا کرتی۔

مذہبی ٹھیکیدار ہمیشہ علم، آگہی اور جدت کے مخالف ہوتے ہیں کیونکہ علم پیدا کرنے والی جدید خیالات کی متلاشی قومیں کبھی بھی مذہبی پنڈتوں کے دام میں نہیں آتیں۔ لہٰذا وادیٔ سندھ کے پروہتوں نے بھی شدت پسندانہ اور سوچ مخالف اندھے اعتقاد پر مبنی عقائد ساری تہذیب میں اچھی طرح پھیلا دیئے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ترقی جو ہمارے آباء نے صدیوں کی علم دوستی کی بدولت حاصل کی تھی وہ پروہتوں کے چکر میں پڑ کر دہائیوں میں جاتی رہی۔ آہستہ آہستہ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ مزید ترقی مکمل طور پر رُک گئی اور پھر وہ تہذیبیں جو ہم سے پیچھے تھیں آگے نکل گئیں اور انحطاط کا شکار ہوتے ہوتے ہڑپہ کی تہذیب ایک دن نیست و نابود ہو گئی۔

آریا

آریا لوگ آج سے قریب چھ ہزار سال قبل خوراک کی تلاش میں اپنی جنم بھومی یعنی وسطی ایشیا سے نکلنا شروع ہوئے اور اگلے کئی ہزار سال تک دنیا کے مختلف علاقوں میں جا کر پہلے لوٹ مار اور پھر حکومتیں کرتے رہے۔

یورپ میں یہ لوگ جرمنی تک گئے اور پھر وہیں بس گئے۔ راستے میں یہ افغانستان، ایران، عراق اور ترکی وغیرہ میں بھی بستے گئے۔ لفظ ایران آریا سے ہی نکلا ہے اور قدیم فارسی سنسکرت سے بہت ملتی جلتی زبان تھی۔

وسدی ایشیا کے یہ آریا لوگ آج سے چار ہزار سال قبل ایران اور افغانستان سے ہوتے ہوئے ہند میں پاکستان کے راستے ہی داخل ہوئے۔ چونکہ اُس زمانے میں سارے ہندوستان میں ایک ہی تہذیب تھی جو کہ پاکستان میں بس رہی تھی اس لئے آریا نے پاکستان پر حملہ کیا۔ یہ ہڑپہ کی تہذیب کے زوال کا زمانہ تھا۔ یہاں کے لوگ تہذیب یافتہ اور امن پسند تھے جبکہ آریا بھوکے، لڑاکے اور جنگلی تھے لہٰذا وہ جیت گئے اور موہنجوڈرو اور ہڑپہ سمیت وادیٔ سندھ کے تمام شہر نیست و نابود کر دیئے۔ کیونکہ آریا لوگ تہذیب یافتہ نہ تھے لہٰذا ان کو شہروں میں رہنے کی تمیز نہ تھی چنانچہ یہ لوگ شہروں کو تباہ کرنے کے بعد پنجاب اور سندھ کے جنگلوں میں بستے گئے۔ یہاں یہ لوگ گائوں بنا کر لکڑی اور مٹی کی جھونپڑیوں میں رہا کرتے تھے۔ ان لوگوں کو اپنے شہر بسانے، علم حاصل کرنے اور اپنی تہذیب جو کہ وادیٔ گنگا کی ویدک تہذیب کہلاتی ہے، کی بنیاد رکھنے میں مزید ایک ہزار سال لگ گئے۔ اب وہ زمانہ آگیا جب سکندر اعظم ہندوستان پر حملہ کرنے والا تھا۔

آریا نسل کے لوگ گورے چٹے اور لمبے تڑنگے تھے۔ چونکہ یہ وسطی ایشیا کے برفانی علاقوں کے رہائشی تھے جہاں صحرائوں کی طرح خوراک نایاب ہوتی ہے اس لئے یہ بڑے جنگجو بھی تھے۔ مشہور امریکی تاریخ دان وِل ڈیورانٹ کے مطابق جب یہ وادیٔ سندھ میں وارد ہوئے تو تہذیب سے نہ آشنا تھے اس لئے منافق بھی نہ تھے۔ لہٰذا

ان کی زبان میں جو لفظ "جنگ و جدل" کے لئے استعمال کیا جاتا تھا اس کے معنی تھے "مزید مویشیوں کی طلب۔"

ہندوستان میں یہ لوگ شمالی جانب سے حملہ آور ہوئے اور مقامی دراوڑ نسل کے لوگوں کو جنوبی ہندوستان میں دھکیل دیا۔ آریائوں کی فتح کی ایک وجہ یہ تھی کہ وہ جنگ کے لئے گھوڑے استعمال کرتے تھے جبکہ وادیٔ سندھ میں گھوڑا ابھی سِدھایا نہ گیا تھا۔

لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ شمالی ہندوستان و پاکستان کے لوگ گورے، بڑی کاٹھی کے اور تیکھے نین نقش کے حامل ہیں نسبتاً جنوبی ہند کے لوگوں کے جو چھوٹی کاٹھی، کالے رنگ اور چوڑے ناک کی وجہ سے ممتاز ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ یہ آریا لوگوں کی آمد اور شمالی ہند میں بس جانے کے بعد ہی ہوا کہ شمالی ہند اچھے جنگجو اور حکمران پیدا کرنے لگا جب کہ تمام فنکار اور فلسفی جنوبی ہند میں پیدا ہوئے۔

وادیٔ سندھ اور باقی ہندوستان میں رہنے والے دراوڑوں کو آریا قوم نے جنوبی ہند میں دھکیل دیا اور جو شمال میں رہ گئے اُن کو غلام بنا کر شودر یا اچھوت بنا دیا۔

اس ڈر سے کہ چوڑی ناکوں والے کالے اچھوت، جو کہ ہندوستان میں بہت زیادہ تعداد میں تھے، ستواں ناک والے آریائوں کی نسل نہ خراب کر دیں، شادی کے اصول وضع کئے گئے جن میں سب سے سخت اصول یہ تھا کہ آریا نسل کے فرد کی شادی کسی بھی صورت شودر نسل میں نہ ہو سکتی تھی۔

یہی شادیوں کے اصول وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتے گئے اور ہندو مت میں

ذات برادری کی رسموں کی وجہ بنے۔

مقامی دراوڑوں کو محکوم بنانے کے بعد حکمران آریائوں نے ان کو دو حصوں میں بانٹ دیا۔ جو مقامی ہندومت قبول کرلیتے اُن کے لئے سب سے نچلی ذات مخصوص تھی جس کا نام ''شودر'' تھا۔ جبکہ وہ مقامی جو آریائوں کا مذہب بھی قبول نہ کرتے تھے اُنہیں کوئی ذات الاٹ نہ کی جاتی تھی۔ یہ لوگ ذات سے باہر تھے لہٰذا ان سے کسی قسم کا میل جول نہ رکھا جاسکتا تھا۔ ایسا کرنا ہندو دھرم کے خلاف تھا۔ یہ لوگ آگے چل کر ''اچھوت'' کہلائے کہ یہ ایسے پلید انسان بن گئے جنہیں چھولینا بھی گناہ تھا۔ ان اچھوتوں کا مزید استحصال کرنے اور اُنہیں لوٹنے، مار بھگانے اور قتل کرنے کی خاطر آریا انہیں کافر، آریا دیوتائوں کا گستاخ اور واجب القتل تک ٹھہراتے تھے۔

جب انگریز یہاں آئے تو بہت سے شودر اور اچھوت لوگ عیسائی ہوگئے۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے ہاں بہت سے مقامی عیسائی کالی رنگت اور چپٹے ناک رکھتے ہیں۔

ویدوں اور رامائن کے زمانے میں، یعنی آج سے قریب تین ہزار سال قبل ہندومت میں سب سے اونچی ذات کھشتری یعنی جنگجو لوگوں کی ذات تھی اور برہمن دوسرے درجے کی ذات سمجھی جاتی تھی۔ مگر وقت کے ساتھ ساتھ پنڈتوں نے مذہب کو ایسا اُلجھایا اور اس وقت کی واحد پڑھی لکھی ذات ہونے کے ناطے تاریخ کو ایسا توڑ مروڑ کر پیش کیا کہ چند ہی صدیوں میں برہمن ہندومت کی اعلیٰ ترین ذات بن گئی اور حرام حلال سے لے کر جنگ کرنے تک کے تمام فیصلے ان کی مرضی سے ہونے لگے۔

آریا لوگ جب ہندوستان میں داخل ہوئے تو اپنے ساتھ کچھ قبائلی مذہبی

رسومات اور اپنے دیوتا بھی لائے۔ مگر یہاں آکر انہوں نے ایک نئے اور دنیا کے بڑے مذہب ''ہندومت'' کی شروعات کیں۔

آریا لوگوں نے یہاں ہندومت کی جو سب سے پرانی مذہبی کتب تحریر کیں، جو اُن کے عقیدے کے مطابق الہامی اور بے حد مقدس کتب ہیں وہ ''وید'' کہلاتی ہیں۔ ویدوں میں سب سے پرانی اور سب سے مشہور ''رگ وید'' ہے جس کے معنی ہیں ''علم کی تعریف''۔ یہ آج سے تین ہزار سال قبل سنسکرت زبان میں لکھی گئی تھی۔ پرانے زمانے میں برہمن ویدوں کو حفظ کر کے سینہ بہ سینہ محفوظ کرتے اور اگلی نسلوں تک پہنچاتے اس لئے ویدوں کی زبان زیادہ تر شاعرانہ اور مترنم ہوا کرتی تھی تاکہ یاد رکھنے میں آسانی رہے ۔ یہ سلسلہ لکھائی کے عام ہونے سے پہلے ہزاروں سالوں تک چلتا رہا۔

ویدوں میں اسی بات پر خصوصی توجہ دی گئی ہے کہ دنیا ایک عارضی ٹھکانہ ہے لہٰذا انسان کو اپنی آخرت کی فکر کرنی چاہیئے۔ نیز یہ کہ دنیا میں افضل ترین کام ''حقیقت'' کی تلاش ہے جس کو پانے کے بعد ہی انسان جنت میں داخل ہو سکے گا۔

ویدوں کے علاوہ آریائوں نے اور بھی مقدس مذہبی کتابیں لکھیں جن میں مہابھارت اور رامائن شامل ہیں جبکہ مشہور زمانہ بھگوت گیتا دراصل مہابھارت کا ایک حصہ یا سورۃ ہے۔

مہابھارت کی کتاب دراصل ایک لاکھ شعروں یا آیات پر مشتمل طویل نظم ہے۔ جس میں ایک مذہبی اور اخلاقی واقعہ کا بڑا عمدہ بیان ہے۔

مہابھارت کے مطابق پانچ ''پانڈو'' بھائیوں کی ایک مشترکہ بیوی

"دروپدی" تھی۔ ہندوستان اور نیپال کے سرحدی علاقوں میں آج بھی ایسے قبائل بستے ہیں جن میں کئی آدمیوں کی ایک مشترکہ بیوی ہوتی ہے یا دوسرے لفظوں میں ایک عورت کے کئی خاوند ہوتے ہیں۔

یہ "پانڈو" بھائی اپنے ایک سو (100) "کورو" چچیرے بھائیوں سے جوئے میں تیرہ سال کے لئے اپنی بیوی اور سلطنت ہار جاتے ہیں۔ پانڈو یہ شرط پوری کرتے ہیں۔ مگر جب تیرہ سال بعد "پانڈو" بھائی اپنے چچیرے "کورو" بھائیوں سے اپنی بیوی اور سلطنت واپس مانگتے ہیں تو "کورو" بدنیت ہو کر مکر جاتے ہیں۔ یہاں سے مہابھارت یُدھ یعنی ہندوستان کی عظیم جنگ کی کہانی شروع ہوتی ہے۔ مہابھارت اسی جنگ کی کہانی ہے۔

بھگوت گیتا یعنی خدا کا گیت سات ہزار شعروں یا آیات پر مبنی مہابھارت کا ایک حصہ یا سورۃ ہے۔ اس میں بیان کیا گیا ہے کہ جنگ سے پہلے کس طرح مہاراج کرشن پانڈو بھائی ارجن کو فلسفیانہ زندگی اور مذہبی جنگ یا جہاد کا سبق دیتے ہیں۔

آریا سماج میں جنگ کے بعد لوٹ مار کا سامان مالِ غنیمت کے طور پر بانٹا جاتا۔ ہاری ہوئی قوم کے آدمیوں اور بچوں کو غلام جبکہ عورتوں کو کنیزیں بنالیا جاتا۔

آریا نسل کی آمد سے پہلے وادیٔ سندھ میں عورت کا بڑا مقام تھا۔ یہ دیوی ماتا ہی تھی جو زمین سے خوراک پیدا کرتی تھی اور اگلی نسل کو جنم دیتی تھی۔ نسل ماں سے چلتی تھی اور اگر کسی قبیلے میں زیادہ شادیوں کا رواج تھا تو عورت کو اجازت تھی کہ وہ ایک وقت میں کئی خاوند پال سکتی نہ کہ مرد۔ ماں کی عظمت، بہن اور بیٹی سے پیار اور بیوی سے شریکِ حیات کے جذبات اسی ورثے کا حصہ ہیں۔

جب آریا یہاں وارد ہوئے تو ہمارے دراوڑ پُرکھوں کو غلام اور شودر بنا کر نئے معاشرتی اصول وضع کئے جن کے مطابق نسل باپ سے چلنے لگی، جبکہ عزت جنگجو اور پروہت کے حصے میں آئی۔ چونکہ اِن پیشوں میں عورت شامل نہ تھی لہٰذا حقیر ٹھہری اور ایک سے زیادہ شادیاں کرنے کا حق بھی مرد کو ملا۔

رگ وید جو پاکستان کے علاقے میں لکھی گئی، دیوتا سے دعا کرتی ہے کہ نیک لوگوں کو بیٹے عطا کرے۔ آریا سماج میں بیٹے طاقت اور عزت کی دلیل تھے اور باپ کی جائیداد صرف بیٹوں ہی کو وراثت میں ملتی تھی۔ چونکہ مرتے دم تک مرد ہی اپنے خاندان کا سربراہ ہوتا تھا لہٰذا اُس کے جیتے جی اُس کے تمام بیٹوں اور ان کے بیوی بچوں کو اُسی کے گھر میں رہنا پڑتا تھا۔ اس طرح سے خاندانی زمین زیادہ عرصے تک اکٹھی رہتی تھی اور خاندان ہی سے ہل جوتنے کے لئے زیادہ مرد میسر آجاتے تھے۔ یہ بڑے خاندانوں میں رہنے کی روایت ہمارے ہاں آج تک چلی آرہی ہے۔

ویدوں کے مطابق ہر رات شیطانی دیوتا ورترا سورج سمیت زمین اور تمام زندگی کو اپنی کالی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ جب اِندر دیوتا کو پتہ چلتا ہے تو وہ روزانہ جا کر شیطانی دیوتا سے لڑتا ہے اور اسے شکست دے کر اُس کا کالا پردہ پھاڑ دیتا ہے جس سے صبح ہو جاتی ہے۔ اس جنگ میں اِندر دیوتا کو تقویت پہنچانے کے لئے برہمن ہر روز فجر کے وقت اشلوک پڑھتے ہیں۔

یہودی

بائبل کے عہد نامہ عتیق کے مطابق توریت کی کتاب پیدائش میں درج ہے کہ حضرت ابراہیمؑ عراق میں بصرہ کے قریب واقع شہر اُر (Ur) کے باسی تھے۔ خدا

نے اُنہیں فلسطین عطا کیا اور بندگی کی نشانی کے طور پر اپنی نسل کا ختنہ کرنے کا حکم دیا۔

ماہرین کا خیال ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کا زمانہ آج سے چار ہزار سال قبل کا ہے۔ یہ وہ وقت تھا جب کہ ہڑپہ کی تہذیب اپنی ہزاروں سالہ مدت پوری کر کے زوال پذیر تھی اور پاکستان میں آریاؤں کی آمد کی ہلکی پھلکی شروعات ہو رہی تھیں۔

پھر جب حضرت موسیٰؑ یہودی قوم کو فرعونِ مصر کے چنگل سے نکال کر لائے تو یہ زمانہ آج سے تقریباً سوا تین ہزار سال پہلے کا ہے۔ اس وقت پاکستان میں دراوڑوں کو شکست دے کر آریا اپنی حکومتیں قائم کر چکے تھے اور وید لکھے جا رہے تھے۔

پھر یہ حضرت ابراہیمؑ کی جنم بھومی عراق کا ہی بادشاہ نبوکد نضر تھا جس نے 587 قبل مسیح میں یروشلم میں تعمیر شدہ پہلا ہیکلِ سلیمانی تباہ کر دیا اور تمام یہودیوں کو غلام بنا کر عراق لے گیا۔ اسی بادشاہ نے بابل کے تاریخی معلق باغات بھی تعمیر کروائے تھے۔

تقریباً آدھی صدی بعد ایرانی شہنشاہ کورشِ اعظم نے جب عراق اور فلسطین فتح کئے تو یہودیوں کو آزاد کر کے فلسطین واپس جانے کی اجازت دی اور آتش پرست ہوتے ہوئے بھی اپنے خرچے پر فلسطین میں دوسرا ہیکلِ سلیمانی (سلیمان کا مندر) تعمیر کروایا۔ اِسی وجہ سے یہودی ایرانیوں سے بے حد متاثر ہو گئے تھے۔ آتش پرستی ایران کا ہزاروں سالہ پرانا مذہب تھا جس میں خدا اور شیطان کی لڑائی کے لئے میدان جنگ دنیا تھی، اور آتش پرستوں کو دن میں پانچ بار ایک خاص طرف مُنہ کر کے آگ کی عبادت کرنی ہوتی تھی۔ مزید برآں، ہر عبادت سے پہلے پاک ہونے کے لئے ہاتھ پیر

اور مُنہ بھی دھونا ہوتے تھے۔

اسی کورشِ اعظم کا جانشین شہنشاہ دارا تھا جس نے 516 قبل مسیح میں پاکستان فتح کر کے اسے سلطنتِ ایران میں شامل کر لیا۔

ایران

اُن دنوں جب نیپال کے پیدائشی گوتم بدھ اُتر پردیش میں بدھ مت کی تعلیم دے رہے تھے اور بہار کے سپوت مہاویر وہاں جین مت کی روشنی پھیلا رہے تھے ایرانی شہنشاہ دارا نے 516 قبل مسیح میں تقریباً تمام پاکستان فتح کر کے سلطنتِ ایران کا حصہ بنا لیا۔ چنانچہ چالیس سال بعد جب دارا کے بیٹے اخسویرس (Xerxes) نے یونان پر حملہ کیا تو اس جنگ میں اُس کی فوج کے پاکستانی تیر اندازوں کے دستے نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

پاکستان ایرانی سلطنت کا بیسواں صوبہ بنا دیا گیا اور تاریخِ قدیم ایران سے پتا چلتا ہے کہ پوری ایرانی سلطنت کا یہ سب سے امیر صوبہ تھا، جو سکندرِ اعظم کے ایران اور پاکستان کی فتح تک قائم رہا۔

عظیم ایرانی شہنشاہ کورش / سائرس اعظم نے ایران کے ساتھ عراق اور یونان بھی فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لئے تھے۔ جب اُس کے جانشین دارا نے پاکستان کو بھی ایرانی سلطنت کا حصہ بنا لیا تو پاکستان کا رابطہ ایرانی، عراقی اور یونانی تہذیب سے بھی ہو گیا۔ ایرانیوں نے نہ صرف پاکستان کا رابطہ صدیوں بعد ایران، عراق اور یونان کی عظیم تہذیبوں سے کروایا بلکہ تحریری زبان بھی متعارف کروائی جو ہڑپہ تہذیب کی تباہی کے بعد سے ناپید تھی۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ سکندر کی آمد کے وقت ایک بار پھر پاکستان علم و فن میں باقی ہندوستان سے کہیں آگے تھا اور خاص کر ٹیکسلا کی یونیورسٹیاں یونان تک مشہور تھیں۔

سکندر

علم کی عظمت برقرار رکھنے کی خاطر 399 قبل مسیح میں زہر کا پیالہ پینے والے عظیم یونانی فلسفی سقراط کا شاگرد تھا افلاطون۔ افلاطون کے فلسفے کے سکول، جس کا نام اکیڈمی تھا، میں علم حاصل کرنے والے فلسفی ارسطو کا شاگرد سکندر یونانی جب دنیا فتح کرنے نکلا تو عراق سے ہوتا ہوا ایران آن پہنچا۔

330 قبل مسیح میں سکندر نے ایران فتح کر لیا جس کے ساتھ ہی بلوچستان اور خیبر بھی اُس کے تصرف میں آ گئے۔ پنجاب اور سندھ کی ریاستیں اب تک ایران سے بغاوت کر کے آزاد ہو چکی تھیں۔

ایران فتح کرنے کے بعد سکندر نے پنجاب کا رُخ کیا اور 326 قبل مسیح میں ٹیکسلا کی راجدھانی پر حملہ آور ہوا۔ یہاں کے راجہ نے لڑے بغیر ہار مان لی کیونکہ سکندر کی فوج بہت بڑی تھی۔ یہاں سے سکندر پنجاب کے ایک بڑے راجہ پورس پر حملہ آور ہوا۔ سکندر اور پورس کی فوجوں کا سامنا ضلع گجرات کی تحصیل منڈی بہاؤالدین میں ہوا اور گھمسان کا رَن پڑا۔ کچھ ماہرین کا خیال ہے کہ سکندر جیتا جبکہ کچھ ماہرین سمجھتے ہیں کہ جنگ راجہ پورس جیتا۔ بہر حال اس بات پر سب متفق ہیں کہ اس جنگ کے بعد پنجاب کا حکمران راجہ پورس ہی رہا اور پورس اور سکندر دوست بن گئے۔

اس جنگ کے ٹھیک تین سال بعد سکندر کو عراق کے علاقے میں کفن میں

لپیٹ دیا گیا۔

راجہ پورس سے جنگ سے پہلے کچھ دن سکندر نے ٹیکسلا میں گزارے۔ یہاں اُس نے جو کچھ دیکھا وہ ہمیں اُس وقت کے پاکستان کے بارے میں کافی کچھ بتاتا ہے۔

مثلاً اُس نے دیکھا کہ ٹیکسلا کے لوگ ایرانی پارسیوں یعنی آتش پرستوں کی طرح اپنے مُردوں کو گِدھوں کے آگے ڈال دیتے تھے۔ شاید اُن کا خیال تھا کہ یہ طریقہ لاش کو آگ میں جلا دینے یا مٹی میں دبا کر کیڑے مکوڑوں کی خوراک بنانے سے بہتر تھا۔

اسی طرح سکندر نے دیکھا کہ ٹیکسلا میں جوان لڑکیوں کا بازار سجتا تھا جس میں وہ شریف خاندان جو غربت کی وجہ سے اپنی بیٹیوں کو جہیز نہ دے سکتے تھے ، اپنی نیک اور پاکباز بیٹیاں بیچنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔

موریہ

موریہ سلطنت جو ایک سو چالیس سال تک ہندوستان اور پاکستان پر حکومت کرتی رہی سکندرِ اعظم کے ہندوستان سے لوٹتے ہی 322 قبل مسیح میں وجود میں آگئی تھی۔ اس کا بانی عظیم شہنشاہ اشوکِ اعظم کا دادا چندر گپت موریہ تھا۔

چندر گپت موریہ کا وزیر اعظم کوتلیہ چانکیہ وادیٔ سندھ کا ایک برہمن تھا۔ چانکیہ کی سیاست پر لکھی کتاب "ارتھ شاستر" دنیا کی عظیم کتابوں میں شمار ہوتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ جواہر لال نہرو اور چو این لائی سمیت دنیا کے کئی عظیم رہنما اس کے بے حد مدح تھے۔

چانکیہ اور چندر گپت کی ملاقات کے بارے میں بھی دلچسپ کہاوتیں مشہور

ہیں۔ کہتے ہیں کہ جوانی میں چندر گپت ایک جنگ ہار کر جنگلوں میں جا چھپا۔ ایک دن اُس کا گزر جنگل کے ایسے علاقے سے ہوا جہاں ایک کٹیا بنی ہوئی تھی۔

اس کٹیا میں ایک رِشی / جوگی رہتا تھا۔ چندر گپت نے اُس کے ہاں پناہ لے لی۔ اگلے دن چندر گپت نے دیکھا کہ رِشی کٹیا کے آس پاس پانی ڈال رہا ہے۔ چندر گپت کے دریافت کرنے پر اُس نے بتایا کہ اُس کی کٹیا کے ارد گرد بہت سی جنگلی گھاس اُگی ہوئی تھی جو اُس کے پائوں میں زخم کر دیتی تھی۔ اس پر چندر گپت نے حیرت سے پوچھا کہ بابا پھر گھاس کاٹنے کے بجائے اُسے پانی کیوں دے رہے ہو؟ تو رِشی نے مسکرا کر کہا کہ بیٹا یہ چینی ملا پانی ہے۔ یہ پانی زمین میں جذب ہو جائے گا اور یہ چینی گھاس کی جڑوں میں بیٹھ جائے گی۔ یہ چینی جب کیڑے مکوڑے کھانے آئیں گے تو ساتھ ہی گھاس کی جڑیں بھی کھا جائیں گے اور گھاس خود بخود مر جائے گی۔ اُسی دن چندر گپت نے فیصلہ کر لیا تھا کہ بادشاہ بننے کے بعد اسی عقلمند رِشی، جس کا نام کوتلیہ چانکیہ تھا، کو اپنا وزیر اعظم بنائے گا۔

305 قبل مسیح میں چندر گپت موریہ نے پانچ سو جنگی ہاتھیوں کے عوض ایران کے حکمران یونانیوں سے پنجاب کا علاقہ خرید لیا۔ چندر گپت کے پوتے اشوکِ اعظم کی سلطنت میں تقریباً سارا پاکستان شامل تھا۔

اشوک

اشوکِ اعظم کی سلطنت آج کے سارے ہندوستان، پاکستان اور دوسرے ہمسایہ ملکوں کے کچھ حصوں پر محیط ایک وسیع و عریض اور عظیم سلطنت تھی۔ اس کا صدر مقام صوبہ بہار کا شہر پٹنہ تھا جو اُس وقت پاٹلی پتر کہلاتا تھا جس کی آبادی ڈیڑھ

لاکھ نفوس پر مشتمل تھی۔ دوسرے مشہور شہروں میں ٹیکسلا سرِ فہرست تھا۔

اشوکِ اعظم کے پاس فوج کا ایک جمِ غفیر تھا۔ خیال ہے کہ اُس کی فوج میں صرف پیادہ فوجیوں کی تعداد چھ لاکھ کے لگ بھگ تھی جبکہ ہاتھی، گھوڑے اور دوسرے فوجی اس کے علاوہ تھے۔

موریہ سلطنت کے بانی چندر گپت موریہ کے اس پوتے نے چالیس سال بڑی شان و شوکت سے حکومت کی (272-232 ق۔م)۔

اپنے دور حکومت کے پہلے آٹھ سالوں میں اشوک نے خوب جنگ و جدل کی اور اپنی سلطنت کو بڑھایا۔ پھر اُس نے خلیجِ بنگال کے تجارتی راستوں پر کنٹرول حاصل کرنے کے لئے ہمسایہ ریاست اوڑیسہ پر قبضہ کر لیا۔ اس جنگ میں بے پناہ تباہی ہوئی اور ایک لاکھ سے زیادہ لوگ مارے گئے۔

اس جنگ کی تباہی نے اشوک کی کایا ہی پلٹ دی اور اُس نے ساری سلطنت میں اعلان کروا دیا کہ آج کے بعد وہ لوگوں کو اپنے اچھے برتاؤ سے اپنا تابع بنائے گا نہ کہ اپنی طاقت اور جنگ سے۔

اشوک کا دورِ حکومت ایک خوشحال، ترقی پسند اور عدل و انصاف پر مبنی دور تھا۔ اُس کی سلطنت میں ہر مذہب کا احترام کیا جاتا تھا اور ہر کسی کو اپنے مذہب پر عمل کرنے کی اجازت قانون کے ذریعے دی گئی تھی۔

اشوک نے اپنی سلطنت میں سڑکوں کا جال بچھوایا تاکہ صنعت و تجارت کو فروغ ملے۔ مسافروں کی سہولت کے لئے ان سڑکوں کے کنارے سایہ دار درخت لگوائے، اور جگہ جگہ کنویں کھدوائے اور سرائیں بنوائیں۔ اس کے علاوہ اُس نے

انسانوں اور جانوروں کے علاج کے لئے سرکاری ہسپتال بنوائے اور مذہبی رسوم میں جانوروں کی قربانی پر پابندی لگادی۔

انصاف کے لئے ملک بھر میں عدالتیں قائم کردی گئیں جن کے فیصلوں کے خلاف لوگ بڑی عدالتوں میں اپیل بھی کرسکتے تھے۔

موریہ سلطنت کے زوال کے بعد ریاستوں نے بغاوتیں کردیں اور ہندوستان و پاکستان پھر سے چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹ گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مغرب میں سلطنتِ روما زور پکڑ رہی تھی اور عرب دنیا میں حضرت عیسیٰؑ کا ظہور تھا۔

موریہ دور میں ہندو مت کا اثر کم ہو گیا تھا اور بدھ مت کا اثر بڑھ گیا تھا۔ مگر چھوٹی ریاستوں کے قیام کے ساتھ ہی مقامی راجائوں نے ہندو مت کو پھر سے فروغ دینا شروع کردیا۔

اب کی بار چونکہ برہمنوں نے اپنا رتبہ اور مقام کھو کر واپس پایا تھا لہٰذا وہ بپھر کر آئے اور ہندو مت میں سخت قوانین بنائے گئے۔ مشہورِ زمانہ "منو کے قوانین" بھی اسی زمانے میں مرتب ہوئے۔ بیوہ کی شادی گناہ ٹھہری، گنگا کا پانی مقدس ہوا اور مندروں میں مورتیاں براجمان ہوئیں۔

موریہ سلطنت اُس زمانے کی ترقی یافتہ ترین سلطنت تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اس سلطنت میں غلاموں کی تعداد باقی دنیا کے مقابلے میں بے حد کم تھی اور قوانین میں غلاموں کو بے مثال حقوق دیئے گئے تھے۔ اسی طرح یہ دنیا کی پہلی سلطنت تھی جس میں جنگ بھی اصولوں کے تحت کرنے کے قوانین رائج تھے۔

گپت

موریہ سلطنت کے بعد گپت خاندان نے ایک بار پھر کافی سارے ہندوستان کو یکجا کر کے اس پر دو سو سال حکومت کی(320 تا 540ء)۔ مگر اس سلطنت میں پاکستان کے علاقے شامل نہ تھے جو بدستور مختلف ریاستوں میں بٹے رہے جن پر مقامی راجہ حکومت کرتے رہے۔

گپت خاندان کا زوال وسطی ایشیا کے ہن قبائل کے مسلسل حملوں سے ہوا۔ آہستہ آہستہ یہ ہن قبائل ہندوستان میں ہی بس گئے۔ کہا جاتا ہے کہ ہندوستان کے راجپوت اور جاٹ اصل میں ہن قبائل کی نسل سے ہیں۔

یہ وہی ہن قبائل ہیں جنہوں نے سلطنتِ روما کے ناک میں بھی دم کئے رکھا اور جن سے بچنے کے لئے دیوارِ چین بھی استعمال کی گئی۔

گندھارا

ٹیکسلا کے شہر اور گرد و نواح کے پنجاب اور خیبر کے علاقے میں پانچویں صدی قبل مسیح سے پانچویں صدی عیسوی تک بدھ مت کے فلسفے اور فن بت تراشی نے بے پناہ ترقی کی۔ اس کی شہرت ساری دنیا میں پھیل گئی اور مشرق و مغرب سے لوگ یہاں علم و فن کی تعلیم حاصل کرنے آتے۔ ایسے ہی لوگوں میں عیسائیت کے مشہور عالم سینٹ تھامس بھی شامل ہیں جو حضرت عیسیٰؑ کے مصلوب کئے جانے کے چند ہی برس بعد ٹیکسلا میں جلوہ افروز ہوئے۔

اسی پاکستانی تہذیب کو گندھارا علم و فن کے نام سے جانا جاتا ہے۔

مشہور عالم پانینی (350ق م) جس نے سنسکرت زبان کی پہلی گرائمر لکھی

اور چندر گپت موریہ کا وزیر اعظم اور مشہورِ زمانہ کتاب ارتھ شاستر کا مصنف کوتلیہ چانکیہ بھی ٹیکسلا کی یونیورسٹیوں کے تعلیم یافتہ تھے۔

یہاں پر فنِ مجسمہ سازی نے بھی بے پناہ ترقی کی۔ گندھارا آرٹ کی خاصیت یہ ہے کہ یہ ہندوستانی، ایرانی اور یونانی فنون کے حسین امتزاج سے معرضِ وجود میں آیا۔

☆☆......☆☆

تیسرا باب

عرب اور غزنوی

(700ء سے 1100ء)

عربوں کی یلغار

حضرت آدمؑ سے حجاج تک

قصص الانبیاء کی کتب کے مطابق جب حضرت آدمؑ جنت سے نکالے گئے تو وہ ہندوستان کی سرزمین کے جنوبی جزیرے سری لنکا پر اُتارے گئے جبکہ امّاں حوّا سرزمینِ عرب پر، اور پھر ان دونوں کی ملاقات مقامِ جدّہ میں ہوئی۔ اس حساب سے سرزمینِ عرب اور ہندوستان کے تعلقات نہایت قدیمی ہیں۔

ظہورِ اسلام سے بہت پہلے سے ہندوستان کے پھلوں، خوشبو ؤں اور مصالحوں کی مانگ مصر سے لے کر یورپ تک تھی۔ عرب کے تاجر یہ مال بحری جہازوں کے ذریعے جنوبی ہند کی بندر گاہوں سے یمن لے کر جاتے جہاں سے یہ اشیاء خشکی کے راستے شام کی بندر گاہوں تک لے جائی جاتیں۔ وہاں سے یہ سامان پھر سے بحری جہازوں پر لاد کر مصر اور یورپ تک لے جایا جاتا۔

زمانہء قدیم میں تو اس تجارت میں ہندوستانی تاجر بھی پیش پیش تھے مگر

آہستہ آہستہ عقل پر ہندو مت غالب آنے لگا۔ ہندو مت میں کئی فرقے بن جانے کی وجہ سے ہندو مت کی دائمی مذہبی رواداری کو خیر آباد کہہ کر دین کو سخت سے سخت تر بنایا جانے لگا تھا۔ حالات اس نہج پر پہنچ گئے کہ ذات کی ناپاکی کے ڈر سے سمندری سفر مذہبی طور پر حرام قرار پایا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عرب تاجروں کی مزید چاندی ہو گئی اور بحر ہند کی تجارت پر اُن کا راج ہو گیا۔

تجارت پھلتی پھولتی گئی تو آہستہ آہستہ بہت سے عرب تاجروں نے جنوبی ہندوستان کی ساحلی بستیوں میں گھر بسالئے اور مقامی عورتوں سے شادیاں رچالیں۔ چونکہ جنوبی ہند کی بہت سی ریاستوں، جن میں مدراس سر فہرست تھی، کی خوشحالی کی ضامن عرب بحری تاجروں کی تجارت تھی لہٰذا ہندو راجہ نہ صرف عرب تاجروں کو اپنی سرزمین پر گھر بسانے کے لئے خوش آمدید کہتے بلکہ ہر طرح سے ان کی حوصلہ افزائی بھی کرتے۔

یہی عرب تاجر ظہورِ اسلام کے بعد جنوبی ہند سے ملائیشیا اور انڈونیشیا تجارت کرنے گئے جس کی وجہ سے وہاں کے لوگ پُر امن طور پر مسلمان ہوتے گئے۔

سرزمینِ ایران عرب فوجوں نے خلیفہء دوم حضرت عمرؓ کے زمانے میں 651ء میں ہی فتح کرلی تھی۔ حضرت عثمانؓ کے دورِ خلافت میں عرب فوج دریائے سندھ کے کنارے تک جا پہنچی مگر خلیفہ نے انہیں واپس بلالیا۔ تاریخ دان بلاذری (متوفی 892ء) کے مطابق اس فوج کے سپہ سالار نے سندھ کے بارے میں خلیفہ کو لکھا تھا کہ یہاں پانی کی قلت ہے، پھل خراب اور ڈاکو خونخوار ہیں۔ اگر تھوڑی فوج بھیجی گئی تو اس کا قتلِ عام ہو گا اور اگر زیادہ بھیجی گئی تو بھوکی مرے گی۔

اموی خلیفہ الولید اول کا دور (705-715ء) وہ دور تھا جس میں اسلامی سلطنت نے ہر طرف پھیلاؤ کیا۔ مغرب کی طرف سپین اور افریقہ میں موسیٰ بن نصیر، مشرق میں قطیبہ اور جنوب میں حجاج بن یوسف نے فتوحات کیں۔ حجاج بن یوسف، جس نے قرآنِ کریم پر اعراب لگوائے تھے، اٹھارہ سال تک عراق، ایران اور مشرقی صوبوں کا گورنر رہا۔

محمد بن قاسم سے پہلے عربوں نے کئی مرتبہ سندھ اور بلوچستان پر حملہ کیا اور ہمیشہ سندھی اور بلوچی فوجوں سے شکست فاش کھائی۔ ایک مرتبہ جب عرب فوج فاتح بھی ہوئی تو سندھ پر حکومت قائم نہ کرنے کا فیصلہ کیا گیا البتہ مکران کے ساحل پر ایک عرب گورنر ضرور مقرر کر دیا گیا۔

عربوں کی ایرانی فتوحات کے دوران ہمسایہ ریاست سندھ کے راجہ نے عربوں کے خلاف جنگ میں مدد کے لئے اپنی فوجیں ایرانی بادشاہ کو بھجوائی تھیں۔ تب سے ہی عرب سندھ کے راجہ سے ناراض تھے۔ سونے پہ سوہاگہ یہ ہوا کہ چند عرب باغی بھاگ کر سندھ کے راجہ داہر کی پناہ میں آ گئے جو حجاج کی درخواست کے باوجود راجہ داہر نے اُس کے حوالے نہ کئے۔ لہٰذا حجاج راجہ داہر پر بری طرح برہم تھا۔

710ء کے آس پاس عرب تاجروں کے جہاز سری لنکا سے کچھ سامان بشمول شاہِ سراندیپ کی طرف سے خلیفہ اور حجاج کے لئے تحائف اور عرب تاجروں کے خاندان لے کر حجاز جا رہے تھے کہ سندھ کے ساحلی شہر دیبل کے نزدیک بحری قزاقوں نے اُسے لوٹ لیا۔ بحرِ ہند میں عرب تاجروں کا لُٹنے والا یہ پہلا بحری قافلہ نہ تھا۔ بلکہ اس علاقے میں بحری قزاقوں کے حملے معمول بنتے جا رہے تھے جس سے عربوں کی

ہندوستان سے تجارت خطرے میں پڑتی جارہی تھی۔ لہٰذا سندھ سے ملحقہ اموی صوبے کے گورنر حجاج بن یوسف نے سندھ کے ہندو راجہ داہر کو خط لکھا کہ وہ بحری قزاقوں کو سزا دے اور جہازوں کا مال و متاع اور قیدی واگزار کروائے۔ راجہ داہر نے جواب دیا کہ وہ یہ کام کرنے سے قاصر ہے کیونکہ بحری قزاق اُس کی دسترس سے باہر ہیں۔ غضبناک ہو کر حجاج نے دو فوجیں سندھ پر حملے کے لئے بھیجیں مگر دونوں ہی سندھی فوج سے شکست کھا کر نامراد لوٹیں۔

تب حجاج نے شام میں مقیم اموی خلیفہ الولید اوّل سے باقاعدہ اجازت لے کر ایک بڑی فوج تیار کی۔ یہ فوج حجاج نے اپنے چچازاد بھائی اور داماد عمادالدین محمد بن قاسم کی کمان میں دی جو اُس وقت بلوچستان سے ملحقہ ایران کے علاقے شیراز کا گورنر تھا۔

محمد بن قاسم کے حملے

ساتویں صدی عیسوی میں سندھ اور ملتان کے زیادہ تر عوام بدھ تھے اور اُن پر ایک بدھ راجہ حکومت کرتا تھا۔ 622ء میں اسی بدھ راجہ کے ہندو وزیر ''چچ'' نے دھوکے سے راج گدی حاصل کرلی۔ جب بدھ عوام، مید اور جاٹ ذاتوں نے اس کی مخالفت کی تو اُن پر ہر طرح کی سختیاں کی گئیں۔ جاٹ اور مید ذاتوں کی تذلیل کے لئے اُن کو ہتھیار رکھنے، سر ڈھانپنے اور جوتے تک پہننے کی ممانعت کر دی گئی۔

راجہ داہر اسی راجہ ''چچ'' کا بیٹا تھا اور اُس نے باپ کی پالیسیاں جاری رکھی تھیں۔ لہٰذا عوام عمومی طور پر اور بدھ، مید اور جاٹ خصوصی طور پر راجہ داہر کے خلاف تھے اور اس مخالفت میں عرب فوج کی ہر طرح سے مدد کر رہے تھے۔

محمد بن قاسم کی سربراہی میں عرب افواج مکران کے راستے سندھ کے ساحلی شہر دیبل پہنچیں۔ راستے میں انہیں مکران کے گورنر سے فوجی کمک دی گئی اور پھر مقامی مید اور جاٹ بھی سندھ کے راجہ داہر کے خلاف عرب فوج سے آملے۔

دیبل کا گورنر راجہ داہر کا بھتیجا تھا جس نے جم کر مقابلہ کیا اور عرب فوج کی ایک نہ چلنے دی۔ قریب تھا کہ عرب فوج دل ہار دیتی کہ ایک غدار برہمن عربوں سے آن ملا اور یہ خبر دی کہ برہمنوں نے دیبل کے بڑے مندر پر اشلوک پڑھ کر ایک سرخ جھنڈا تان رکھا تھا، اور فوج اور عوام کا ایمان تھا کہ جب تک وہ جھنڈا اسلامت رہے گا دیوتا اُن کے مددگار رہیں گے۔ اگر وہ جھنڈا گر جائے تو فوج دل ہار بیٹھے گی۔ اس مخبری پر عربوں نے اپنی تمام توپوں کا رُخ مندر کی طرف کر دیا اور آخر کار وہ سرخ جھنڈا گرا لیا۔ نتیجتاً دلبر داشتہ ہو کر سندھی فوج نے ہتھیار ڈال دیئے۔

محمد بن قاسم نے سندھ میں عمومی طور پر منصفانہ اور رحملانہ رویہ روا رکھا تھا۔ مگر شاید سندھ کی افواج اور عوام پر عرب فوج کی دھاک بٹھانے اور اپنی آئندہ کی فتوحات کی راہ ہموار کرنے کے لئے محمد بن قاسم نے اپنی پہلی فتح پر دیبل کے شہر پر قیامت برپا کر دی۔ شہر میں تین دن تک قتلِ عام کیا گیا اور تمام مرد جنہوں نے اسلام قبول کرنے سے انکار کر دیا تہہ تیغ کر دیئے گئے۔ عورتوں اور بچوں کو کنیزیں اور غلام بنا لیا گیا اور سارا شہر لوٹ لیا گیا۔ اس لُوٹ کا پانچواں حصہ خلیفہ کو بھجوا کر باقی تمام مال فوج میں مالِ غنیمت کے طور پر بانٹ دیا گیا۔ جاٹوں کو عربی میں ''زط'' کہا جاتا تھا۔ عربوں نے بے شمار جاٹ غلام بنا کر عراق میں بیچ ڈالے۔

راوڑ کے مقام پر عربوں اور راجہ داہر کا معرکہ ہوا اور راجہ داہر اپنے ہاتھی

پر بیٹھا فوج کی کمان کر رہا تھا کہ بد قسمتی سے اُس کا ہاتھی زخمی ہو کر بھاگ کھڑا ہوا۔ راجہ داہر نے ہاتھی سے چھلانگ لگا دی اور گھوڑے پر سوار ہو کر جوانمردی سے دشمن کا مقابلہ کیا۔ مگر شاہی ہاتھی کو بھاگتے دیکھ کر فوج سمجھی کہ راجہ بھاگ کھڑا ہوا ہے، اور دل ہار بیٹھی۔ راجہ داہر آخری دم تک لڑتا رہا۔

داہر کی ملکہ رانی بائی اور قلعہ کی پندرہ ہزار عورتوں نے قلعے کے دروازے بند کر کے عربوں پر پتھروں اور تیروں کی بارش کر دی۔ مگر جب شکست ہوتی دیکھی تو ناموس کی خاطر خود اپنی جان لے لی مگر دشمن کے ہاتھ آنا گوارہ نہ کیا۔

راجہ داہر کا سر قلم کروا کر خلیفہ کی خدمت میں تحفہ کے طور پر روانہ کر دیا گیا۔ داہر کی دو کنواری بیٹیاں، سُوریا دیوی اور پَرمل دیوی، مالِ غنیمت کے طور پر کنیزیں بنا کر خلیفہ کی خدمت میں بھیج دی گئیں۔ داہر کی دوسری بیوی رانی لاڈی سے محمد بن قاسم نے شادی کر لی۔

آخر کار محمد بن قاسم ملتان کے دروازے پر آن پہنچا۔ یہاں بھی راجپوتوں، جاٹوں، سندھیوں اور پنجابیوں نے عرب فوج کے چھکے چھڑوا دیئے۔ بہت کوشش کے باوجود ملتان فتح نہ ہوا۔ آخر کار ایک غدار نے عربوں کو وہ خفیہ چشمہ دکھایا جہاں سے شہر کو پانی پہنچ رہا تھا جسے بند کرنے پر ملتان کے باسیوں کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کیا گیا۔ ملتان سے عربوں کو اس قدر سونا ملا کہ انہوں نے اس شہر کا نام ”سونے کا شہر“ رکھ دیا۔

سندھ پر قبضے سے عربوں کی ہندوستان اور سری لنکا سے سمندری تجارت محفوظ ہو گئی۔

دیبل میں جن ہندوئوں اور بدھوں نے اسلام قبول نہ کیا اُنہیں کافر قرار

دے کر قتل کر دیا گیا۔ لیکن جلد ہی یہ حقیقت قبول کر لی گئی کہ ہندوستان میں ہندو اور بدھ بے شمار تھے اور اُن سب کا قتل ایک مشکل اور تھکا دینے والا کام ثابت ہو گا۔ لہٰذا ایرانی آتش پرستوں کی طرح انہیں بھی اہلِ کتاب قرار دے کر ذمیوں میں شامل کر لیا گیا۔

اسلامی فقہ کے مطابق صرف یہودیوں اور عیسائیوں کو ہی اہلِ کتاب قرار دیا جا سکتا تھا جبکہ ہندوئوں اور بدھوں کو اہلِ کتاب اور ذمی قرار دینا غیر اسلامی تھا۔ مگر چونکہ محمد بن قاسم کے زمانے میں ابھی اسلامی فقہ کے اصول وضوابط اتنی سختی سے مرتب نہ کیئے گئے تھے لہٰذا اُس وقت یہ عمل عین اسلامی ٹھہرا۔

ہندوستانیوں پر لگائے گئے جزیے سے برہمن لوگ مستثنٰی تھے، اور باقیوں پر بھی جو جزیہ لگایا گیا تھا وہ مسلمانوں کے زکوٰۃ وصدقہ ٹیکس سے بہت کم تھا جو کئی دفعہ ساڑھے بارہ فی صد تک پہنچ جاتا تھا۔ ویسے بھی یہ جزیہ ہر ہندوستانی کی معاشی استطاعت کے مطابق مقرر کیا جاتا تھا جسے جمع کرنے کی ذمہ داری بھی عربوں نے برہمنوں کو ہی سونپ رکھی تھی۔

محمد بن قاسم کی موت

محمد بن قاسم کی دردناک موت کے بارے میں کئی کہانیاں مشہور ہیں جن میں سب سے مشہور یہ ہے کہ جب راجہ داہر کی بیٹیاں خلیفہ کے حرم میں کنیزوں کے طور پر شامل ہوئیں اور خلیفہ نے اُن سے ہم بستری کرنی چاہی تو انہوں نے خلیفہ سے کہا کہ محمد بن قاسم نے اُنہیں خلیفہ کی خدمت میں بھیجنے سے پہلے اُن کی عصمت دری کی تھی۔ اس پر غضبناک ہو کر خلیفہ نے حکم دیا کہ محمد بن قاسم کو گائے کی کھال میں سِلائی

کر کے اُس کے سامنے پیش کیا جائے۔ محمد بن قاسم کو یہ حکم ملا تو اُس نے بلا چوں و چرا اپنے آپ کو گائے کی کھال میں سِلوا دیا۔ کہا جاتا ہے کہ اُس کھال میں محمد بن قاسم کی جان نکلتے نکلتے تین دن لگ گئے۔ جب محمد بن قاسم کی لاش خلیفہ کے سامنے آئی تو راجہ داہر کی بیٹیوں نے خلیفہ کو بتایا کہ اُنہوں نے اپنے باپ کی موت کا بدلہ لینے کے لئے محمد بن قاسم پر جھوٹا الزام لگایا تھا۔ اس پر تیش میں آکر خلیفہ نے ان دونوں بہنوں کو بھاگتے گھوڑوں کے پیچھے بندھوا کر مروا دیا۔

لیکن اصل واقعہ یہ ہے کہ محمد بن قاسم اموی دربار کی سیاستوں کی بھینٹ چڑھ گیا۔ بالکل اُسی طرح جس طرح طارق بن زیاد درباری سیاست کی نذر ہو گیا۔

محمد بن قاسم کے ساتھ ہی 711ء میں اموی افواج نے سپین پر بھی حملہ کیا تھا۔ اس فوج کی قیادت افریقی نژاد بَربَر جرنیل طارق بن زیاد نے کی تھی جس نے سپین کے ساحل پر اُتر کر تمام کشتیاں جلوا دی تھیں تا کہ فوج کے پاس بھاگنے کا کوئی راستہ نہ بچے۔ یہی طارق بن زیاد، جو فاتح سپین تھا، بعد میں حجاز کی گلیوں میں بھیک مانگتا دیکھا گیا۔

اموی خلیفہ الولید اوّل (جس کے دور میں محمد بن قاسم نے سندھ فتح کیا) کے دربار میں محمد بن قاسم کے گورنر، سُسر اور چچازاد بھائی حجاج بن یوسف کا بڑا اثر و رسوخ تھا۔ 714ء میں حجاج کی وفات کے بعد فروری 715ء میں خلیفہ الولید اوّل کا بھی انتقال ہو گیا۔ لہٰذا فروری 715ء سے الولید اوّل کا چھوٹا بھائی سلیمان بن عبد المالک خلیفہ بنا جس کی حجاج بن یوسف سے پرانی عداوت تھی۔ نئے خلیفہ کے آتے ہی حجاج مخالف گروہ نے خلیفہ کے کان بھرے، نتیجتاً چار ہی ماہ بعد جولائی 715ء میں خلیفہ نے محمد بن

قاسم کی موت کا حکم سُنا دیا۔

اس وقت تک محمد بن قاسم کی انسان دوست پالیسیاں اور رویہ اہلِ سندھ کے دلوں میں گھر کر چکا تھا اور تاریخ دان بلاذری (وفات 892ء) کے مطابق سندھ کے عوام محمد بن قاسم کے جانے پر روئے اور اُس کی یاد میں کرج کے مقام پر اُس کا ایک مجسمہ بھی تعمیر کیا گیا۔

محمد بن قاسم کے بعد

محمد بن قاسم کے بعد بھی عربوں نے اپنی جارحانہ کارروائیاں جاری رکھیں اور شروع میں کامیابیاں حاصل کرتے رہے۔ معاملہ یہاں تک جا پہنچا کہ کشمیر کے راجہ نے گھبرا کر شہنشاہِ چین سے مدد مانگ لی۔ اس زمانے میں ملتان سندھ کا حصہ تھا جبکہ ریاست کشمیر پنجاب کے بیشتر شمالی حصہ پر قابض تھی۔ بہر حال کچھ ہی عرصے بعد عربوں کو پے در پے شکستیں ہوئیں اور مقامی سرداروں نے عربوں کو دھکیل کر چھوٹے سے علاقے میں سکیڑ دیا۔

750ء میں جب بنو امیہ کو ہٹا کر بنو عباس خلافتِ اسلامیہ پر براجمان ہوئے تو اُنہوں نے سندھ میں بھی اپنے افسر تعینات کر دیئے۔ جلد ہی سندھ میں بھی عرب قبائلی چپقلش شروع ہو گئی اور وہ یمنی اور حجازی گروپوں میں تقسیم ہو گئے۔ آہستہ آہستہ سندھ کے عربی گورنر خلافت سے آزاد ہو گئے اور سندھ اور ملتان میں دو عرب خاندانوں نے علیحدہ علیحدہ چھوٹی چھوٹی راجدہانیاں قائم کر لیں۔ چونکہ سندھ عرب سلطنت کا ایک غریب صوبہ تھا لہٰذا خلیفہ کی دلچسپی اس میں بتدریج کم ہوتی گئی۔

977ء میں قاہرہ کی فاطمی سلطنت نے ملتان پر قبضہ کر لیا جو سلطان محمود غزنوی کے حملوں تک قائم رہا۔ غزنوی کی وفات کے بعد ملتان میں ایک بار پھر اسماعیلی

حکومت قائم ہو گئی۔ آخر کار 1175ء میں محمد غوری نے ملتان فتح کر کے یہاں پر ایک راسخ العقیدہ سُنّی گورنر تعینات کر دیا اور اسماعیلی حکومت کا مکمل خاتمہ کر دیا۔

سورج کا ملتان کی ثقافت میں ہمیشہ سے گہرا اثر رہا ہے۔ عربوں کی فتح کے وقت ملتان میں ایک بہت بڑا ''سورج مندر'' تھا جس کی یاترا کے لئے ہندو دور دور سے آتے تھے۔ اس مندر کے گرد ملتان کا بڑا بازار آباد تھا۔ عربوں نے جب ملتان میں جامع مسجد تعمیر کی تو وہ بھی اسی سورج مندر کے قرب میں تھی۔

عرب، ہندوستان اور اسلام

عربوں نے تو ہندوستان کو کچھ خاص نہ دیا مگر ہندوستان نے عربوں کو بیش بہا تحائف دیئے جن میں ادب اور شطرنج سے لے کر ریاضی تک بہت کچھ شامل ہے۔ عربی زبان کا لفظ ''ہندسہ'' عرب ریاضی پر ہندوستانی اثرات کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

ہندوستان کی مسلم تاریخ میں عرب سندھ کا کوئی خاص قابلِ ذکر کردار نہ رہا۔ نہ تو ہندوستان میں اسلام سندھ کے ذریعے پھیلا اور نہ ہی ہندوستان کی مسلم حکومت کی بنیاد عربوں نے ڈالی۔ ہندوستان کے مسلم حکمران عرب نہیں بلکہ وسطی ایشیا کے آریا نسل کے مسلمان تھے جو درۂ خیبر کے ذریعے ہندوستان پر حملہ آور ہوتے رہے اور انگریزوں کی یلغار تک ہندوستان پر قابض و حکمران رہے۔

ترکوں کی یلغار

وسطی ایشیا کے مسلمان

دسویں صدی عیسوی تک عالمِ اسلام میں انقلاب آ چکا تھا۔ دارالخلافہ مدینہ سے دمشق اور وہاں سے بغداد پہنچ چکا تھا۔ خلافتِ راشدہ اموی اور وہاں سے خاندانِ

عباسیہ میں داخل ہو چکی تھی۔ سلطنتِ خلافت اتنی پھیل چکی تھی جو ایک خلیفہ کے لئے ناقابلِ حکومت تھی۔ لہٰذا اس کے کئی علاقے آہستہ آہستہ خود مختار ممالک میں تبدیل ہوتے رہے، گو نام کو وہ ہمیشہ خلیفہ ہی کو اپنا حکمران کہتے رہے۔ سلطنتِ غزنی بھی وسطی ایشیا کے ترکوں کی ایک ایسی ہی مملکت تھی۔

پاک و ہند پر جتنے بھی مسلمان حکمرانوں نے حملہ کیا، چاہے وہ عرب ہوں یا وسطی ایشیا کے ترک، غزنوی کے علاوہ سب نے یہاں حکومت بنائی اور یہاں کے لوگوں سے اپنی رعایا کا سا سلوک کیا۔ محمود غزنوی نے جو کہ اپنی سلطنت میں ایک عادل اور فیاض حکمران تھا، کبھی ہندوستان کے بڑے علاقے پر حکومت نہ کی۔ لہٰذا یہاں کے لوگوں نے ہمیشہ محمود غزنوی کو ایک ڈاکو کی طرح دیکھا جو ہتھیاروں سے لیس ہو کر اللہ اکبر کے نعرے لگاتا آتا، اُنہیں لُوٹتا، اُن کے مردوں کا قتلِ عام کرتا اور اُن کی عورتوں اور بچوں کو غلام بنا کر لے جاتا۔

چونکہ عربوں کی فتوحات سندھ اور پنجاب کے کچھ علاقوں تک ہی محدود رہی تھیں لہٰذا ہندوستان میں عمومی طور پر لوگوں کی مسلمانوں سے پہلی ملاقات محمود کے حملوں کے ذریعے ہی ہوئی۔

ترک

وسطی ایشیا کے برفانی پہاڑوں میں رہنے والے جنگلی قبائل ہمیشہ سے ہندوستان کی زرخیز سرزمین پر حملہ آور ہوتے رہے ہیں۔ ان لوگوں میں آریا، ہُن، منگول اور ترک شامل تھے۔

چھٹی صدی عیسوی سے وسطی ایشیا کے خانہ بدوش قبائل کے لئے ''ترک'' کا

نام استعمال ہونا شروع ہوا۔ سنسکرت میں ان ترکوں کو "ترک شک" کہا جاتا تھا۔ موجودہ ملک ترکی اُس زمانے میں اناطولیہ کہلاتا تھا اور اُس کے باشندوں کو بہت صدیوں کے بعد ترک کہا جانے لگا۔

جب نویں صدی عیسوی میں مسلمانوں نے وسطی ایشیا فتح کیا تو یہاں کے نوجوان ترکوں کو بڑی تعداد میں پکڑ کر بطور غلام فروخت کیا گیا۔ یہ مملوک کہلائے، جو انتہائی سفاک اور لڑاکے لوگ تھے۔

ان ترک غلاموں کے محافظ دستے مسلمان حکمران اور امراء ملازم رکھتے تھے۔ چونکہ یہ کرائے کے فوجی ہوتے تھے اس لئے ان کی وفاداریاں بھی بدلتی رہتی تھیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ ترک محافظ خلیفہ پر حاوی ہوتے گئے۔ آہستہ آہستہ ان ترک غلام محافظوں کو ہی خلیفہ کی طرف سے مختلف صوبوں کا گورنر لگایا جانے لگا۔ تو ہوا یوں کہ ترک وسطی ایشیا سے غلاموں کے طور پر نکل کر دمشق اور بغداد پہنچے اور پھر وہاں سے گورنروں کے طور پر ایران اور واپس اپنے آبائی علاقے وسطی ایشیا میں تعینات ہوئے۔

دسویں صدی عیسوی میں چین کے حملوں کی وجہ سے ترک بڑی تعداد میں وسطی ایشیا سے ایران اور افغانستان میں آکر بستے گئے۔ اسلام سے قبل ایرانیوں اور ترکوں میں جنگیں ہوتی رہتی تھیں۔ لہٰذا اسلامی حکومت میں بھی ایرانیوں اور ترکوں کی عداوت چلتی رہی۔

غزنی

انہی ترکوں میں سے ایک الپتگین تھا جس نے افغانستان کے مقام غزنی میں

ایک چھوٹی سی سلطنت قائم کر رکھی تھی۔ الپتگین کے بعد اُس کا غلام سبکتگین شاہ غزنی ہوا اور اُس نے کچھ فتوحات بھی کیں۔ سبکتگین کے بعد اُس کا بیٹا محمود غزنوی سلطانِ غزنی بنا۔

قصہ کچھ یوں ہوا کہ نویں صدی عیسوی میں عباسی سلطنت ٹوٹنا شروع ہو گئی اور دور دراز کے علاقوں میں مسلم گورنروں نے خود مختار حکومتیں قائم کر لیں۔ وسطی ایشیا کی ساسانی سلطنت بھی ایک ایسی ہی سلطنت تھی جو ایران سے ایشیائے کوچک تک محیط تھی اور جس کا دارالحکومت بخارہ تھا۔

دسویں صدی عیسوی میں یہ ساسانی سلطنت بھی ٹوٹنے لگی۔ اس کے صوبہء ایران پر ترک غلام الپتگین گورنر مقرر تھا جس نے 963ء میں بغاوت کر دی اور افغانستان کے ایک چھوٹے سے شہر غزنی پر قبضہ کر کے اپنی علیحدہ اور خود مختار حکومت کا اعلان کر دیا۔

الپتگین کے بعد اُس کا ایک آزاد کردہ ترک غلام، جو الپتگین کا داماد بھی تھا، غزنی کا حکمران بنا۔ اس کا نام سبکتگین تھا۔

سبکتگین کہتا تھا کہ وہ ایران کی ایک شاہی نسل سے تعلق رکھتا ہے۔ اُس کے مطابق جب عربوں نے ایران پر قبضہ کر لیا تو یہ شاہی خاندان وہاں سے بھاگ کر ترکستان جا بسا۔ جب سبکتگین بارہ سال کا تھا تو دشمنوں نے اُسے اغوا کر کے بخارہ میں غلام کے طور پر بیچ دیا جہاں سے اُسے الپتگین نے خرید لیا۔

محمود نے بھی ہمیشہ ایرانی بادشاہوں جیسا جاہ و جلال رکھا، ایرانی بادشاہوں کی کہانیوں سے مزین شاہ نامہ لکھوایا اور فارسی زبان کی پذیرائی کی اور اُسے سرکاری

زبان بنایا۔ یہی وجہ تھی کہ پاک وہند میں مسلمانوں کی حکمرانی کے تمام دور میں، جب تک کہ انگریزوں نے انگریزی زبان رائج نہ کردی، سرکاری سطح پر فارسی زبان ہی رائج رہی۔

محمود کی ماں سبکتگین کی ایک کنیز تھی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ باپ نے محمود کے بجائے اپنے چھوٹے بیٹے اسماعیل کو ولی عہد بنایا۔ مگر سبکتگین کی وفات کے بعد محمود نے اسماعیل کو شکست دے کر اُسے تمام عمر کے لئے نظر بند کر دیا اور غزنی کی حکومت سنبھال لی۔

سلطان محمود غزنوی

محمود کے درباری تاریخ دانوں اور شاعروں نے اُسے مردِ مجاہد کے طور پر پیش کیا جبکہ وہ ایک دانا اور دور اندیش جرنیل اور حکمران تھا جو بیک وقت ہندوئوں اور مسلمانوں سے جنگیں کر کے اپنی سلطنت کی توسیع کرتا جارہا تھا۔

محمود سردیوں میں پاک وہند پر حملے کرتا اور مالِ غنیمت جمع کرتا جو اسے یہاں سے بے شمار ملتا جبکہ گرمیوں میں ایران اور وسطی ایشیا کے مسلم ممالک پر حملے کرتا۔

ہندوستان پر ہر حملے کے بعد غزنی کے خزانے منہ تک بھر جاتے۔ ان جنگوں کے نتیجے میں اتنے لوگ غلام بنائے گئے کہ غزنی میں ہندوستانی غلام کوڑیوں کے مول ملنے لگے۔ محمود کی یہ ہندوستانی فتوحات اور مالِ غنیمت دور دور تک مشہور ہو گئیں اور وسطی ایشیا سے ترک، جو ایک غریب اور سخت جان قوم تھے، جوق در جوق محمود کی فوج میں شامل ہونے لگے۔ تمام نو مسلموں کی طرح دسویں اور گیارہویں صدی عیسوی

کے ترک اسلام پھیلانے میں خاصے جذباتی تھے۔ ترویجِ اسلام کے ساتھ ساتھ تسخیر اور مالِ غنیمت اس جذبے کو چار چاند لگا دیتا تھا۔

محمود نے ہندوستان میں سے صرف پنجاب اور سندھ کے علاقے اپنی سلطنت میں شامل کئے جبکہ ایران اور وسطی ایشیا کی مسلم سلطنتوں کے وسیع و عریض علاقے اپنی سلطنت میں شامل کئے۔

محمود کے سترہ حملے

محمود نے ہندوستان پر پہلا حملہ 1001ء میں کیا اور پشاور کے قریب لڑائی میں راجہ جے پال کو شکست فاش دی جبکہ ہندوستان پر آخری حملہ محمود نے 1024ء میں سومناتھ پر کیا۔

ہندوستان پر محمود نے 17 حملے کئے جس میں سے دو بڑے حملے کانگڑہ اور سومناتھ کے تھے۔

1008ء میں محمود کے مقابلے پر راجہ انندپال تھا جس کی کمان میں کئی ریاستوں کی فوج لڑی۔ پنجاب کے راجہ انندپال کی فوج، خاص طور پر اُس کے گکھڑ دستوں نے سلطان کی فوج کو تہہ تیغ کر ڈالا۔ قریب ہی تھا کہ محمود پسپائی کا اعلان کر دیتا کہ انندپال کا ہاتھی بِدک گیا اور بھاگ نکلا۔ پنجاب کی فوج سمجھی کہ راجہ میدان چھوڑ گیا اور اُس میں افراتفری پھیل گئی۔ اب افغانستان کی ترک فوج نے شیر کی طرح حملہ کیا اور دو دن تک دشمن کی فوج کا قتلِ عام کرتی رہی۔

اس فتح کے نتیجے میں محمود کو کانگڑہ سے اتنا مالِ غنیمت ملا کہ اُسے دیکھنے کے لئے غزنی میں عوام کا جمِ غفیر اکٹھا ہو گیا اور دوسرے ملکوں کے سفیروں نے دانتوں میں

انگلیاں داب لیں۔

کانگڑہ کے بعد کنوج اور پھر مِتھرا کی باری آئی۔ مِتھرا بھگوان کرشن کا مقدس شہر تھا۔ اس کے سب سے بڑے مندر کو دیکھ کر محمود دنگ رہ گیا اور بے اختیار اس کے منہ سے نکلا کہ ایسی عمارت بنانے کے لئے تو کم از کم دو صدیاں چاہئیں۔

بہر حال مِتھرا کی فتح کے بعد سلطان کے حکم سے شہر کے سارے مندر جلا کر اُن پر ہل چلا دیئے گئے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ قدیم ہندوستان کے فن کا ایک بیش بہا خزانہ ان مندروں کے ساتھ ہی فنا ہو گیا۔ مِتھرا کے مندر سے سونے کے اتنے بڑے بڑے بت لُوٹے گئے جنہیں تولنے کے لئے بھی کئی ٹکڑوں میں توڑنا پڑا۔

سومناتھ ہندوستان کا عظیم ترین مندر تھا۔ اس کی خدمت کے لئے دس ہزار گائوں کا ٹیکس مختص تھا۔ روزانہ بارہ سو کلومیٹر دور سے دریائے گنگا کا پوتر پانی لایا جاتا تا کہ دیوتا کا غسل کروایا جا سکے۔ ایک ہزار پنڈت اور پانچ سو داسیاں چوبیس گھنٹے دیوتا کی خوشنودی پر معمور رہتیں۔ مندر میں زائرین کی حجامت، جو کہ مذہبی فریضہ تھی، کرنے کے لئے تین سو حجام دن رات مصروف رہتے۔

مشہور ہے کہ 1024ء میں جب سومناتھ فتح ہو گیا تو مندر میں بھگوان کی مورتی ہوا میں معلق تھی۔ کہا جاتا ہے کہ مورتی ہوا میں معلق اس طرح تھی کہ لوہے کی شبیہ تھی اور کمرے میں چاروں طرف مقناطیس اس حساب سے دیواروں میں جڑے گئے تھے کہ مورتی معلق رہے۔ محمود نے جب اس بت کو توڑنے کے لئے تلوار نکالی تو تمام پنڈت اور داسیاں یک زبان ہو کر فریاد کرنے لگے کہ بھگوان کی مورتی کو نہ توڑا جائے جس فیاضی کے عوض وہ محمود کو ہیرے جواہرات کے ڈھیر دینے کو تیار تھے۔ مگر

محمود نے جواب دیا کہ وہ بت شکن ہے بت فروش نہیں۔ اور تلوار کے وار سے مورتی کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ ایک اور روایت کے مطابق یہ ہوا میں معلق بت نہ تھا بلکہ مردانہ عضوِ تناسل کی شکل کا ایک قد آدم بت تھا۔

جدید تاریخی تحقیق البتہ اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ اگرچہ محمود نے سومناتھ فتح کیا اور خوب مالِ غنیمت لُوٹا مگر نہ تو بت توڑا اور نہ ہی مندر مسمار کیا۔ یہ کہانیاں پہلے انگریزوں نے مسلمانوں اور ہندوئوں میں دوریاں پیدا کرنے کے لئے پھیلائیں اور پھر پاکستان بننے کے بعد دونوں ملکوں میں یہ کہانیاں علاقائی اور مذہبی سیاست کے فروغ کا آلہ ءکار بنیں۔

مشہور تاریخ دان سٹینلے لین پُول کے مطابق سومناتھ پر حملے میں ہندوئوں نے مذہبی جنونیت سے جنگ کی اور پچاس ہزار لوگوں نے اپنے بھگوان کی خاطر جان دے دی۔ سومناتھ سے واپسی پر پنجاب کے جاٹوں نے سلطان کی فوج پر خوب حملے کئے اور سلطان کی فوج بہت سا نقصان اُٹھانے کے بعد بڑی مشکل سے جان بچا کر غزنی پہنچی۔

اگلے سال سلطان نے بدلہ لینے کے لئے جاٹوں پر دوبارہ حملہ کیا اور اُن کو تہہ تیغ کر دیا۔

اکثر محمود کی لُوٹ مار سے ہونے والے نقصان کو پورا کرنے کی خاطر راجے اپنی لُٹی پٹی عوام پر مزید ٹیکس لگا دیتے جسے ”ترشکا ڈنڈا“ ٹیکس کہا جاتا۔

محمود کے زمانے میں ہندوستان چھوٹی چھوٹی بے شمار خود مختار ریاستوں میں بٹا ہوا تھا۔ آخری بار ہندوستان ایک سلطنت کے طور پر گپت سلطنت کے تحت رہا تھا جسے

ختم ہوئے تقریباً ایک ہزار سال گزر چکے تھے۔ چنانچہ ہندوستانی راجائوں نے محمود کو ہندوستان کا دشمن نہیں بلکہ بہت سے راجائوں میں سے ایک راجہ سمجھا اور محمود سے لڑنے کے ساتھ ساتھ آپس کی جنگیں بھی جاری رکھیں۔

چونکہ ہندومت میں شرک وغیرہ کا بھی کوئی مسئلہ نہ تھا اور ہندوستان کے لوگ مذہب سے زیادہ روحانیت کے قائل تھے۔ اس لئے وہ مسلمانوں کو کافر نہیں سمجھتے تھے بلکہ ایک فرق دین کے پیرو کار ہی سمجھتے تھے۔ اسی لئے سوائے برہمن ذات کے باقی لوگ ضرورت پڑنے پر مسلمان ہونے اور پھر واپس ہندو ہونے یا محمود کی فوج میں شامل ہو کر ہندو راجائوں کے خلاف لڑنے کو بھی کچھ خاص معیوب نہ جانتے تھے۔

محمود بطور حکمران

محمود ایک عظیم جرنیل اور کمال کا حکمران تھا۔ مشہور سلجوق وزیر نظام الملک طوسی نے اپنی کتاب سیاسیات میں محمود کے عدل و انصاف کے بارے میں کئی مثالیں رقم کی ہیں۔

محمود فطرتاً ظالم نہ تھا اور بلاضرورت قتلِ عام کا ارتکاب نہ کیا کرتا تھا۔ نہ ہی وہ مذہبی انتہا پسند تھا۔ محمود کی فوج میں بہت سارے ہندو دستے تھے اور کئی ہندو اعلیٰ فوجی افسر بھی تھے۔ اگرچہ جب ضرورت پڑتی تو محمود نو مسلم ترکوں کا جذبہ ءجہاد سیاسی طور پر استعمال کرتا اور اُنہیں کفارِ ہندوستان کے خلاف جزبے سے لڑنے پر آمادہ کرتا۔ مگر محمود نے صرف کفار کو قتل کر کے اُن کے مندروں ہی کو مسمار نہ کیا بلکہ مسلمانوں کا بھی بے دریغ قتلِ عام کیا اور مسجدوں کو مسمار کیا۔

محمود اسماعیلیوں کے سخت خلاف تھا۔ ملتان کی قرامطیہ اسماعیلی حکومت

عباسی خلیفہ نہیں بلکہ قاہرہ کی فاطمی خلافت کے تابع تھی، جس کے خلاف غزنی میں تحریک زوروں پر تھی۔ محمود نے ملتان کو فتح کر کے اسماعیلی مسلمانوں کا ہزاروں کی تعداد میں نہ صرف قتلِ عام کیا بلکہ بے شمار مسجدوں کو بھی نیست و نابود کر دیا۔

محمود ہندوستان سے صرف مالِ غنیمت ہی نہیں بلکہ کاریگر، ہنر مند اور دست کار بھی لے کر جاتا۔ انہی لوگوں نے غزنی کو دنیا کا ایک عظیم شہر بنا دیا۔

پنجاب کے سلطنتِ غزنی میں شامل ہونے کی وجہ سے لاہور ایک بڑا شہر بن گیا اور وسطی ایشیا، ایران اور عرب سے صوفیاء، علماء اور شعراء یہاں آ کر آباد ہو گئے۔ محمود نے اپنے غلام ایاز کو لاہور کا گورنر مقرر کر دیا تھا۔

محمود نے غزنی میں ایک عظیم الشان یونیورسٹی تعمیر کروائی جو ایک عظیم کتب خانے اور بڑے عجائب گھر سے مزین تھی جس میں مستقل پروفیسر اور دانشور طالب علموں کو پڑھانے کے لئے مقرر تھے۔ عظیم الشان مسجدوں، سڑکوں، فواروں اور عمارتوں سے مزین کر کے محمود نے غزنی کو ایک پہاڑی قبضے سے بدل کر عالیشان شہر بنا دیا۔

محمود کی سرپرستی کی وجہ سے اس کی ساری سلطنت بشمول ہندوستانی علاقوں میں عربی کی جگہ فارسی نے لے لی اور وہ ایک سرکاری اور مقبول زبان کے طور پر اُبھری۔ اس دور کو فارسی کے احیاء کا دور کہا جاتا ہے۔

محمود ایک غلام کا اَن پڑھ بیٹا تھا مگر وہ اپنا نام اسلام کے بڑے حکمرانوں میں شامل کروانا چاہتا تھا۔ ایک غیر عرب کے لئے اس کا ایک ہی راستہ تھا کہ وہ ایرانی تہذیب میں اپنا نام پیدا کرے۔ چنانچہ اس نے ایران کو سلطنت میں شامل کیا اور گو کہ

وہ خود ترک زبان بولتا تھا مگر اُس نے فارسی کو سرکاری زبان بنایا اور اس کی ترویج کی اور اپنی شان میں قصیدے کہلوائے۔

محمود خود تو پڑھا لکھا نہ تھا مگر دانشوروں اور فن کاروں کی بڑی قدر کرتا تھا۔ اُس کا دربار دانشوروں کی ایک ایسی کہکشاں تھا جو اپنے وقت میں دنیا میں منفرد تھی۔ محمود ایران کے مشہور فلسفی ابنِ سینا کو بھی اپنے دربار میں لانا چاہتا تھا مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ مگر قازقستان کا مشہور فلسفی الفارابی ضرور اس کے دربار کی زینت بنا۔ اس کے علاوہ اس کے درباریوں میں مشہور دانشور البیرونی، اَبتی، عنبقی اور فردوسی شامل تھے۔

ابوریحان البیرونی نے یونانی اور سنسکرت کی کئی کتابیں فارسی میں ترجمہ کیں جبکہ کئی کتب سنسکرت میں تصنیف بھی کیں۔ وہ ہندوئوں کو سنسکرت میں سائنس کی تعلیم بھی دیا کرتا تھا۔ ہندوستان کے کلچر پر البیرونی کی مشہورِ زمانہ کتاب "کتاب الہند" آج بھی ایک کلاسیک کی حیثیت رکھتی ہے۔ البیرونی جسے محمود ایران سے زبردستی غزنی لایا تھا، ہندوئوں کو کمال کے فلسفی، اچھے ریاضی دان اور عمدہ نجومی مانتا تھا۔

شاعر فردوسی کے بارے میں واقعہ مشہور ہے کہ محمود نے اُس سے وعدہ کیا کہ ایران کے بادشاہوں سے متعلق اُس کی مشہور فارسی نظم جب مکمل ہو جائے گی تو سلطان ہر شعر کے عوض فردوسی کو ایک سونے کی اشرفی انعام میں دے گا۔ جب یہ شاہکار نظم مکمل ہوئی تو ساٹھ ہزار اشعار پر مشتمل تھی۔ محمود نے فردوسی کو سونے کی جگہ چاندی کی اشرفیاں بھجوا دیں۔ اس پر فردوسی نے ناراض ہو کر اشرفیاں واپس کر دیں اور محمود کے بارے میں طنزیہ اشعار کہے اور غزنی سے فرار ہو گیا۔ سلطان بڑے دل کا مالک تھا۔ اُس نے فردوسی کو معاف کر دیا اور اُسے سونے کی اشرفیاں بھجوا دیں۔

یہ علیحدہ امر ہے کہ جب یہ اشرفیاں فردوسی کے گھر خراسان پہنچیں تو اُس کا جنازہ تیار تھا۔

محمود نے کبھی کسی ہندو یا بدھ کو مسلمان ہونے پر مجبور نہ کیا تھا۔ بلکہ اُس کی فوج میں بہت سے ہندو تھے جو اُس کی قیادت میں ایران اور وسطی ایشیا کے مسلمانوں سے جنگ کرتے اور اُن کا قتلِ عام کرتے۔

محمود ایک دلیر انسان تھا۔ اُسے زندگی کے آخری تین سال تپِ دق رہی مگر اس نے بستر پر پڑنا قبول نہ کیا اور دن رات تکیوں کی ٹیک لگا کر بیٹھا رہتا اور اسی حالت میں اس کی موت واقع ہوئی۔

☆☆......☆☆

چوتھا باب

تغلق، وجے نگر

اور

بھگتی تحریک

(1300ء سے 1500ء)

سلطان محمد بن تغلق

سلطان محمد بن تغلق حافظِ قرآن، صوم و صلوٰۃ کا پابند اور فلسفہ و منطق کا شوقین تھا۔

محمد بن تغلق کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ صوفیاء کرام پر بڑے ظلم و ستم کیا کرتا مگر علمائے کرام سے بے حد اچھا برتائو رکھتا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ بتائی جاتی ہے کہ اُس دور میں صوفیاء کا اثر ورسوخ عام رعایا اور درباریوں پر بے پناہ تھا اور سلطان سیاسی مقاصد کے لئے اُن کا یہ اثر کم کرنا چاہتا تھا۔

دوسری وجہ علامہ ابنِ تیمیہ کی اصلاحی تحریک کا اثر بتائی جاتی ہے جو انہی

دنوں شام اور مصر میں علامہ نے جاری کر رکھی تھی اور جو آج بھی دہشت گرد جہادی تنظیموں نے اپنا رکھی ہے۔

مشہور سیاح ابنِ بطوطہ محمد بن تغلق کے درباری کی حیثیت سے کئی سال سلطان کے ساتھ منسلک رہا اور اس کے کردار اور حکومت کے بارے میں بے شمار مواد تحریر کیا۔

ایک طرف تو سلطان اس قدر ظالم تھا کہ لوگ اُس کے قہر سے پناہ مانگتے تھے جبکہ دوسری طرف سلطان عوام کی فلاح و بہبود کے لئے کام کرتا اور اُس کی علم دوستی بھی دور دور تک مشہور تھی۔

1325ء سے 1351ء تک حکومت کرنے والے اس سلطان نے ہندوستان میں مسلم حکومت اتنی وسیع کرلی تھی جتنی اس سے پہلے کسی مسلم حکمران نے نہ کی تھی۔ کشمیر اور کیرالہ کے علاوہ تمام پاک وہند سلطان کی سلطنت میں شامل تھا۔

سلطان ہندوستانی امراء کی نسبت ایرانی و تورانی امراء کو ترجیح دیتا تھا جس کی وجہ سے ہندوستانی امراء اس کے خلاف رہتے۔ دوسری طرف علماء چاہتے تھے کہ سلطان حکومت کے ہر فیصلے میں اُن سے مشورہ کرے جبکہ سلطان اپنی طبیعت کا مالک تھا اور اپنی مرضی کیا کرتا۔ لہٰذا اکثر ایرانی و تورانی علمائے دین بھی اُس سے ناراض ہی رہتے اور اُس کے خلاف سازشیں کرتے رہتے۔

متعدد بغاوتوں کو دبانے کی خاطر سلطان نے اپنے دورِ حکومت کے آخری سالوں میں اپنی حکومت پر خلافت کا ٹھپہ بھی لگوانے کی کوشش کی۔ چنانچہ 1342ء میں سلطان نے اعلان کر دیا کہ ہندوستان دراصل خلافتِ اسلامیہ کا حصہ ہے اور وہ

خلیفۃ المسلمین کا نمائندہ ہے۔ اس سلسلے میں سلطان نے ہندوستانی کرنسی پر اپنا نام ہٹا کر خلیفہ کا نام کھدوانا شروع کر دیا۔

سلطان محمد بن تغلق نے اپنے دورِ حکومت میں کئی ترقی پسندانہ اقدامات کئے مگر بدقسمتی سے اُن میں سے کوئی بھی قدم کامیابی سے ہمکنار نہ ہو سکا۔

ایسا ہی ایک قدم سونے چاندی کے سِکّوں کی جگہ جدید طرز کی کرنسی جاری کرنا تھا۔ اُس وقت ہندوستان کے علاوہ دنیا میں صرف دو ممالک، چین اور ایران میں ایسی کرنسی رائج رہی تھی۔ چنانچہ سلطان نے سونے چاندی کے سِکّوں کی جگہ تانبے کے سِکّوں پر مشتمل کرنسی جاری کر دی۔ مگر بدقسمتی سے یہاں کے لوگ اس نظام کی اہمیت نہ سمجھ پائے اور ہر دوسرے گھر میں نقلی کرنسی بنانے کی ٹکسال قائم ہو گئی۔ مجبوراً سلطان کو یہ کرنسی بند کرنا پڑی جس سے خزانے کو بہت نقصان ہوا۔

سلطان نے ٹیکس کا نظام بھی جدت پسندانہ کرنے کے لئے کئی اقدام اُٹھائے مگر ہر نئے قدم نے نئی مشکلات کو جنم دیا۔ مثلاً مالیہ اکٹھا کرنے کے لئے جو جاگیریں دی جاتی تھیں وہ سلطان نے امراء میں بانٹنے کے بجائے نیلامِ عام کے ذریعے دینی شروع کر دیں۔ یہ ایک بہت جدید طریقہ تھا جو آج بھی رائج اور کامیاب ہے۔ مگر اُس وقت کے لوگ سلطان کی ترقی یافتہ سوچ کا ساتھ نہ دے سکے اور اس سکیم کا بھی ستیاناس مار دیا گیا۔ بہت سے ایسے راتوں رات دولت مند بننے کے شوقین میدان میں آ گئے جنہیں لگان کا کچھ تجربہ تھا نہ اندازہ۔ اُنہوں نے بے وجہ بڑی بڑی بولیاں لگا کر جاگیریں تو حاصل کر لیں مگر جب مالیہ اکٹھا کرنے لگے تو بولی کی مناسبت سے مالیہ نہ اکٹھا کر سکے۔ اس کے نتیجے میں کسانوں پر اتنا ظلم کیا گیا کہ اچھے کھاتے پیتے کسان فاقوں

پر آ گئے۔ اس پر ہی بس نہ کی گئی بلکہ مویشی ٹیکس، مکان ٹیکس اور اس طرح کے کئی اور ٹیکس لگا کر کسانوں کی کمر بالکل ہی توڑ دی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کسانوں نے اپنے کھیتوں اور گھروں کو آگ لگا دی اور جنگلوں میں جا کر باغی ٹولے بنا کر لوٹ مار شروع کر دی۔ اس پر سلطان نے طیش میں آ کر فوجوں کو حکم دیا کہ باغی علاقوں میں جہاں کسان نظر آئیں انھیں تہہ تیغ کر دیا جائے اور اُن کا تمام مال و اسباب بحق سرکار ضبط کر لیا جائے۔ ان ظالمانہ اقدام کے نتیجے میں بے شمار کسان لقمہء اجل بن گئے۔

سونے پہ سہاگہ یہ ہوا کہ ان علاقوں میں قحط پڑ گیا اور پورے سات سال بارش نہ ہوئی۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ لوگوں نے مرے ہوئے جانور کھانے شروع کر دیئے اور کئی جگہ تو بھوک سے مجبور لوگوں نے انسانی لاشوں کو بھی کھانا شروع کر دیا۔ اب سلطان کا ظلم رحم میں بدل گیا اور سرکاری گوداموں کے منہ قحط زدہ لوگوں کے لئے کھول دیئے گئے، سرکاری باورچی خانے دن رات لوگوں کو کھانے کھلانے لگے اور کسانوں کو قرضے دیئے گئے۔

سلطان کا ایک اور فیصلہ یہ تھا کہ سلطنت کا دارالحکومت دہلی سے بدل کر دیوگری منتقل کر دیا جائے۔ اس کی دو وجوہات تھیں۔ پہلی تو یہ کہ نیا دارالحکومت سرحد سے دور سلطنت کے درمیان میں ہونے کی وجہ سے منگولوں کے حملوں سے محفوظ رہتا۔ اور دوسرا یہ کہ دیوگری سلطنت کے بیچ میں ہونے کی وجہ سے جنوبی ہندوستان سے بھی نسبتاً قریب تھا اور وہاں سے پوری سلطنت کا نظام سنبھالنا آسان تھا۔ مگر دِلّی کے لوگوں نے سلطان کے اس قدم کی بھی مخالفت کر دی۔

اس پر ایک بار پھر سلطان غضبناک ہو گیا، دیوگری کا نام دولت آباد رکھ دیا

اور دارالحکومت دہلی سے دولت آباد منتقل کر کے دہلی کے تمام لوگوں کو حکم دیا کہ وہ دولت آباد جا کر بس جائیں۔ جب دو اندھے اور لنگڑے فقیروں نے دہلی چھوڑنے سے انکار کر دیا تو سلطان کے حکم پر ایک کو توپ کے دہانے پر باندھ کر اُڑا دیا گیا جبکہ دوسرے کو گھوڑوں کے پیچھے باندھ کر گھوڑے دوڑا دیئے گئے جس سے فقیر کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ لہٰذا دہشت زدہ ہو کر تمام دہلی والے دولت آباد جا بسے۔

دولت آباد آٹھ سال تک ہندوستان کا دارالحکومت رہا جس کے بعد سلطان نے دوبارہ دہلی کو دارالحکومت بنا دیا۔

جنوبی ہندوستان میں کمپالی کے راجہ پر حملہ کر کے سلطان نے وہاں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ راجہ مارا گیا اور رانیوں نے خودکشی کر لی۔ اس کے علاوہ وہاں کے بہت سے امراء گرفتار کر لئے گئے۔ انہی گرفتار امراء میں دو بھائی "ہری ہرا" اور "بُکّا" تھے جنہوں نے اسلام قبول کر لیا اور سلطان کی فوج میں شامل ہو گئے۔ بعد میں یہی دو بھائی دوبارہ ہندو ہو گئے اور انہوں نے جنوبی ہندوستان کی عظیم الشان سلطنت "وجے نگر" کی بنیاد رکھی۔

وجے نگر

آٹھویں سے اٹھارہویں صدی عیسوی تک پاک و ہند پر افغان اور وسطی ایشیا کے ترک مسلمانوں کی حکمرانی رہی۔ اس دوران میں ہندوئوں کی صرف دو ایسی ریاستیں ہندوستان میں قائم ہوئیں جو کہ سلطنتیں کہلا سکتی تھیں۔ ایک تھی جنوبی ہند کی وجے نگر کی سلطنت اور دوسری مرہٹہ راج۔

وجے نگر جو 1336ء سے 1646ء تک قائم رہی، اپنے عروج پر تمام جنوبی ہندوستان کا

احاطہ کئے ہوئے تھی۔ 1526ء میں جب مغل بادشاہ ظہیر الدین بابر نے ہندوستان پر حملہ کیا تو ہندوستان کی سب سے بڑی ریاست ابراہیم لودھی کی مسلم ریاست نہیں بلکہ وجے نگر کی ہندو ریاست تھی۔

وجے نگر کی ریاست تھی تو ہندو سلطنت کیونکہ اُس کے زیادہ تر باسی ہندو تھے اور اُس پر ہمیشہ ہندو راجاؤں نے راج کیا جو ہندو مندروں اور ادب کی بڑی پذیرائی کرتے تھے مگر یہ ریاست ہندو مت کے احیاء سے منسوب نہیں کی جاسکتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ گو اس سلطنت کی مسلم بہمانی ریاست سے بہت سی جنگیں ہوئیں مگر یہ ساری جنگیں زیادہ علاقہ فتح کرنے کے لئے تھیں نہ کہ کسی مذہب کو جتوانے یا ہرانے کے لئے۔ ایسی ہی بہت سی جنگیں وجے نگر نے آس پاس کی دوسری ہندو ریاستوں سے بھی کیں۔

وجے نگر نہ صرف ایک خوشحال ریاست تھی بلکہ اس کی بین الاقوامی تجارت بہت سے ملکوں سے تھی۔ لہٰذا یہاں وجے نگر کی اپنی کرنسی کے ساتھ ساتھ ایرانی، پرتگالی اور اطالوی کرنسی بھی چلتی تھی۔ وجے نگر میں ہندو، مسلم، بدھ، عیسائی، پارسی اور یہودی، غرض کے ہر مذہب کے لوگ رہتے اور کاروبار کرتے تھے۔ گوا اور دوسری بندر گاہوں کی وجہ سے دنیا بھر کے جہاز یہاں ہر قومیت کے تاجروں اور لوگوں کو لے کر آتے جس کی وجہ سے وجے نگر صحیح معنوں میں ایک بین الاقوامی ریاست بن چکی تھی۔

وجے نگر دارالحکومت کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ روم سے بھی بڑا شہر تھا۔ اُس میں ایک لاکھ سے زیادہ گھر تھے اور شہر کی آرائش کے لئے متعدد نہریں،

تالاب اور باغات سجائے گئے تھے۔ اُس وقت جو پرتگالی تاجر وجے نگر آئے اُن کے مطابق ایسا شاندار شہر اُنہوں نے پورے یورپ میں نہ دیکھا تھا۔ وجے نگر کی امارت، اُس کے عظیم الشان مندر، اُس کی بے شمار فوجی قوت اور دلنشیں شہر دیکھ کر یورپی دنگ رہ جاتے۔

وجے نگر میں راجا قانون کا بول بالا رکھتے تھے۔ سزائیں چند مگر سخت تھیں اور انسان اور جائیداد کو قانون ایک ہی نظر سے دیکھتا تھا۔ چنانچہ چھوٹی موٹی چوری پر تو چور کا ایک ہاتھ اور ایک پائوں کاٹ دیا جاتا مگر بڑی چوری یا عزت دار عورت کی عزت پر حملہ کرنے کی سزا موت تھی جو انسان کی ٹھوڑی کے نیچے نوک دار کنڈا کھوب کر لٹکانے سے دی جاتی تھی۔ امیر بے حد امیر تھے جبکہ غریب بے حد غریب۔ گو کہ کسانوں پر لگان، زمین کی حالت اور نوعیت کے مطابق لگایا جاتا تھا مگر پھر بھی اتنا زیادہ ہوتا کہ کسان کی کمر ٹوٹی رہتی۔

وجے نگر کی بہت بڑی فوج تھی جس میں تیس ہزار سے زیادہ گھڑ سوار تھے۔ اس فوج میں ہزاروں مسلمان فوجی بھی شامل تھے جن کے لئے بڑی جاگیریں مختص کی گئی تھیں۔ راجا کے حکم سے اُن کے لئے خاص طور پر ایک مسجد تعمیر کی گئی تھی اور اپنے مسلمان سپاہیوں کی دلجوئی کے لئے راجا دربار میں اپنے سامنے ایک میز پر بڑے احترام سے قرآن پاک رکھا کرتا تھا۔

وجے نگر میں برہمن تو ماس مچھلی کو ہاتھ نہ لگاتے مگر راجا اور پرجا بڑی رغبت سے گوشت کھاتے تھے، اگرچہ سب کٹر ہندو تھے۔ بکرے، سور اور ہر قسم کے پرندوں کا گوشت سرے عام بکتا اور خوب پسند کیا جاتا۔ جانوروں کو مندر میں ذبح کیا

جاتا اور اُن کا خون دیوتا کو بھینٹ چڑھا کر گوشت بازار میں لوگوں کے کھانے کے لئے بیچا جاتا۔

وجے نگر اپنے وقت کی ایک وسیع اور شاندار ہندو سلطنت تھی۔ اپنے عروج کے وقت یہ تقریباً پورے جنوبی ہندوستان پر پھیلی ہوئی تھی اور پاک وہند کی سب سے بڑی اور طاقت ور ریاست تھی۔ اس کے راجا علم و ادب اور فن کے قدر دان تھے جن کے دور میں سنسکرت ادب نے بڑی ترقی کی اور جنوبی ہندوستان میں ہندو فن مصوری، مجسمہ سازی اور تعمیر پر مشتمل محل اور مندر تعمیر کئے گئے۔ سترہویں صدی کے نصف تک وجے نگر کی آب و تاب سے سارا ہندوستان جگمگاتا رہا۔

بھگتی تحریک

پندرہویں صدی عیسوی میں ہندوستان میں ایک منفرد تحریک نے جنم لیا۔ اس تحریک کا مقصد مذہب کو مولوی اور پنڈت کی قید سے آزاد کروا کر، معبود اور بندے کا رشتہ مضبوط کرنا تھا۔ اس تحریک کا نام بھگتی تحریک تھا۔

چونکہ مذہبی رہنمائوں نے مذاہب پر اجارہ داری قائم کر رکھی تھی اس لئے بھگتی تحریک پنڈت اور مُلّا کے سخت خلاف تھی۔ بھگتی تحریک کے رہنما مذہبی رسومات کا بڑا مذاق اُڑایا کرتے تھے کیونکہ اُن کے مطابق ان رسومات کی وجہ سے مُلّا اور پنڈت سماج میں اہم بنے بیٹھے تھے۔

بھگتی تحریک ہندوستان کی مٹی کی تحریک تھی ، یہ کسی ایک مذہب کی تحریک نہ تھی۔ اس تحریک کے رہنمائوں اور ماننے والوں میں ہندو، مسلمان اور دوسرے مذاہب کے لوگ بھی شامل تھے۔ اس تحریک کا مقصد مذہبی تعصبات کو ختم کرکے خدا

اور خدا کے بندوں سے محبت کو پھیلانا تھا۔

بھگتی تحریک کے رہنمائوں کو مسلمان لوگ مسلمان سمجھتے تھے جبکہ ہندو اُنہیں ہندو سمجھتے تھے۔ بھگتی تحریک کے دو مشہور رہنما بھگت کبیر جولاہا اور گورونانک تھے۔ گورونانک سکھ مت کے بانی تھے جبکہ بھگت کبیر کے کئی اشلوک سکھوں کی مقدس کتاب "گرنتھ صاحب" میں شامل ہیں۔ بھگت کبیر کے ماننے والے "کبیر پنتھی" کہلاتے ہیں۔ بھگت کبیر نے 1518ء میں وفات پائی جبکہ بابا گورونانک نے 1538ء میں وفات پائی۔

بھگتی تحریک کا ایک نمایاں مقصد یہ بھی تھا کہ اسلام اور ہندو مت کے عقائد کو باہم ملا کر مذہبی تفریق ختم کر دی جائے تا کہ تمام مذاہب کا زور رسومات اور مذہبی تنازعات سے ہٹ کر مذہبی رواداری، برابری اور محبت پر مرکوز ہو جائے۔

بھگتی تحریک کے مطابق خدا کی رضا اور قربت حاصل کرنے کے لئے ضروری تھا کہ انسان من مار کر خدا کی تلاش میں جُت جائے اور خدا کی مخلوق سے پیار کرے۔ مزید بر آں اس کام کے لئے مندروں اور مسجدوں میں جانا قطعاً ضروری نہ تھا کیونکہ خدا ہر انسان کے اندر بستا ہے۔ اس طرح سے دیکھا جائے تو بھگتوں اور صوفیائے کرام کی بہت ساری تعلیمات ایک سی تھیں۔

بھگتی تحریک نچلے درجے کی پِسی ہوئی ذاتوں کی تحریک تھی۔ اس لئے اس کے رہنما بھی نچلی ذاتوں سے تعلق رکھتے تھے اور اُن کے پیغام بھی عام آدمی کے لئے تھے۔ لہٰذا بھگتوں کے کلام میں دو خصوصیات نمایاں تھیں۔ پہلی یہ کہ ان کے رہنمائوں کے کلام سیدھے سادھے اور آسان تھے جن کو سمجھنے کے لئے کسی مذہبی عالم

کی ضرورت نہ تھی۔ دوئم ہر بھگت نے اپنا کلام اپنی مادری زبان میں لکھا تاکہ اُس علاقے کے عام لوگ اُسے باآسانی سمجھ پائیں۔

☆☆......☆☆

پانچواں باب

اکبر اعظم

(1542ء سے 1605ء)

اکبر سے پہلے کا ہندوستان

اکبر سے پہلے نہ تو کسی مسلمان حکمران نے ہندوستان کو اپنا وطن سمجھ کر اُس پر حکمرانی کی تھی اور نہ ہی وہ جم کر حکمرانی کر پایا تھا۔ مسلمان حکمران اکثر دہلی پر قبضہ جما کر کچھ علاقہ فتح کر کے اپنے زیرِ انتظام لے آتے اور باقی علاقے سے صرف سالانہ باج وصول کرنے پر اکتفا کرتے۔ ان دو طرح کے علاقوں کے علاوہ بھی بہت سا علاقہ ایسا ہوتا جو کبھی تو دہلی کے حکمران کو بادشاہ مانتا اور کبھی آزاد ریاست کی شکل اختیار کر لیتا۔ ویسے بھی درباری سازشیں اور خانہ جنگیوں کا یہ عالم تھا کہ چالیس پچاس سال سے زیادہ کوئی بھی مسلمان خاندان سکون سے ہندوستان پر حکمرانی نہ کر پاتا تھا۔ اس سب کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوستان کی زیادہ تر ریاستوں پر راج مقامی زمینداروں کا ہی رہتا۔ چنانچہ اکبر کے زمانے تک ہندوستان کے زیادہ تر حصے پر اصل اختیار مقامی زمینداروں اور پنچایتوں کا ہی چلتا، جبکہ مرکزی حکومت کا دائرہ اختیار باج کی رقوم اکٹھی کرنے تک محدود رہا کرتا۔

اکبر کے زمانے میں ہندوستان میں اسلام کی پوزیشن کافی کمزور تھی اور اسی وجہ سے علماء کرام بے حد سخت تھے۔ اکبر سے پہلے دو صدیوں تک مسلمانوں کی حکومت تنزلی کا شکار رہی تھی جبکہ دوسری طرف جنوبی ہند میں وجے نگر کی وسیع ہندو سلطنت قائم ہو گئی تھی جس کی وجہ سے جنوب میں اسلامی حکومت کا مکمل خاتمہ ہو چکا تھا۔ بابر کے حملے کے وقت بھی ہندوستان کا سب سے طاقتور حکمران ابراہیم لودھی نہیں بلکہ رانا سانگا تھا۔

دوسری طرف ہندومت کا احیاء بھی شروع ہو چکا تھا اور ہندومت ایک بار پھر تیزی سے مضبوط و مقبول ہو رہا تھا۔ ان دو صدیوں میں بھگتی تحریک نے بھی ہندومت کو بڑی تقویت دی۔ بھگتی رہنما گورو نانک، تلسی داس اور چیتنیہ کے جانشین اس سلسلے میں بڑے متحرک تھے۔

اکبر کی تاج پوشی

اکبر کے دادا اور پہلے مغل بادشاہ ظہیر الدین بابر نے اُزبکستان سے آکر ہندوستان پر حملہ کیا۔ یہاں پر دہلی کے مسلمان حکمران ابراہیم لودھی کو پانی پت کی پہلی جنگ میں شکست دی اور 1526ء میں سلطنتِ مغلیہ کی بنیاد رکھی۔ پانی پت کی تیسری جنگ احمد شاہ ابدالی اور مرہٹوں کے درمیان لڑی گئی تھی جبکہ پانی پت کی دوسری جنگ اکبر نے لڑی تھی، جس کا ذکر آگے آئے گا۔

بابر کے بعد اُس کا بیٹا ہمایوں تخت نشین ہوا۔ مگر افغانی جرنیل شیر شاہ سوری نے 1540ء میں ہندوستان پر حملہ کر کے ہندوستان کی بادشاہت ہمایوں سے چھین لی۔ ہمایوں فرار ہو کر ایران چلا گیا۔ اکبر واحد مغل بادشاہ تھا جو لکھ پڑھ نہیں سکتا تھا کیونکہ

اس کی پرورش بے سروسامانی کے عالم میں ہوئی تھی۔

شیر شاہ سوری کی موت 1545 عیسوی میں ہوئی جس کے بعد اُس کا بیٹا اسلام شاہ پاک وہند کا بادشاہ ہوا۔ مغلوں کی خوش قسمتی سے اسلام شاہ بھی 1554ء میں فوت ہو گیا اور ہندوستان کی بادشاہت کے لئے مختلف طاقتوں میں جنگ چھڑ گئی۔

ہمایوں نے اس موقع سے فائدہ اُٹھایا اور دِلّی پر چڑھائی کر دی۔ ہمایوں کے قابل جرنیل بیرم خاں نے یہ معرکہ جیت لیا اور پاک وہند کی حکومت پھر سے مغلوں کے پاس آگئی۔

1556ء میں ہمایوں کتابیں اُٹھائے اپنے کتب خانے کی سیڑھیاں اُتر رہا تھا کہ اُس کا پائوں پھسل گیا اور سر پر چوٹ لگنے سے اُس کی موت واقع ہو گئی۔

اس وقت اکبر پنجاب کا گورنر تھا۔ بیرم خان نے فوراً ہی اکبر کی تخت نشینی کا اعلان کر دیا۔

14 سالہ اکبر کی تاج پوشی 1556ء میں بیرم خان نے ضلع گورداسپور میں منعقد کی۔ اس موقع پر جس تخت پر اکبر کو بادشاہ کے طور پر بٹھایا گیا وہ دراصل اینٹوں کا ایک تھڑا تھا۔

اکبر کے باپ اور دوسرے مغل شہنشاہ ہمایوں کی اچانک حادثاتی موت پر اکبر کی تاج پوشی کا فوری اعلان ضروری تھا اسی لئے بیرم خان نے عقلمندی سے کام لیتے ہوئے تکلفات ملحوظ خاطر رکھنا ضروری نہ سمجھا۔

تاج پوشی کے وقت اکبر کی سلطنت محض پنجاب اور دہلی پر مشتمل تھی۔

ہمایوں کی وفات پر شیر شاہ سوری کے ایک ہندو وزیر ''ہیمو'' نے مغلیہ

سلطنت پر فوج کشی کر دی اور دِلّی اور آگرہ دونوں پر قبضہ کر لیا۔

اُن دنوں ہندوستان میں سخت قحط کی کیفیت تھی اور لوگ بھوکوں مر رہے تھے مگر ہیمو نے اپنے 1500 ہاتھیوں کی فوج تک کی خوراک میں کوئی کمی نہ آنے دی کیونکہ وہ پانی پت کی دوسری جنگ کی بھرپور تیاری کر رہا تھا۔

1556ء میں یہ جنگ بھی بیرم خان نے اکبر کے جرنیل کے طور پر جیت لی اور ہندوستان اکبر کے نام ہو گیا۔

پانی پت کی دوسری جنگ میں ہیمو کا پلڑا بھاری تھا کہ اچانک مغل فوج کا ایک تیر اُس کی آنکھ میں جا گھسا اور ساتھ ہی جنگ کا پانسہ پلٹ گیا۔

جب ہیمو اکبر کے سامنے لایا گیا تو ابھی اُس میں جان باقی تھی۔ بیرم خان کے کہنے پر اکبر نے اُس کا سر تن سے جدا کر دیا اور غازی کا لقب پایا۔

اکبر اعظم چودہ سال کی عمر میں ہندوستان کا بادشاہ بن چکا تھا۔ اُس کے ان چودہ سالوں کا بیشتر حصہ جنگلوں اور صحراؤں میں گزرا تھا جب اُس کا باپ ہمایوں شیر شاہ سوری سے بھاگتا پھر رہا تھا۔ تختِ ہندوستان پر بیٹھنے سے پہلے اکبر کو حکومت کی کوئی خاص تربیت حاصل نہ رہی تھی۔ چنانچہ اکبر کے دورِ حکومت کے شروع کے چند سال تمام اختیارات اکبر کا لائق اور وفادار جرنیل بیرم خان استعمال کرتا رہا۔

شیعہ ہونے کی وجہ سے بیرم خان دربار کے کٹر سُنّی علماء کو ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ جب تک توجنگ وجدل ہوتی رہی بیرم خان کی کامیابیاں اور فتوحات تمام سازشوں کا منہ توڑ جواب رہیں۔ مگر حالات کے پُرامن ہوتے ہی سازشوں نے سر اُٹھانا شروع کر دیئے۔ علماء کے علاوہ بیرم خان کے اختیارات اکبر کی رضائی ماں ماہم انگا کو بھی قبول

نہ تھے ، اِس لئے وہ بھی ہمہ وقت اکبر کے کان بھرا کرتی۔ اس سب کا نتیجہ یہ نکلا کہ آخر کار اکبر بیرم خان سے بد ظن ہو گیا اور اُس نے بیرم خان کو معزول کر دیا۔ بیرم خان نے سرِ تسلیم خم کیا اور باقی زندگی مکہ مکرمہ میں گزارنے کی نیت سے نکل کھڑا ہوا۔ لیکن خدا کا کرنا کیا ہوا کہ گجرات کے پاس کچھ پٹھان دشمنوں نے اُس پر حملہ کر کے اُسے قتل کر دیا۔ اُس وقت بیرم خان کا چھوٹا بیٹا عبد الرحمن بھی اُس کے ساتھ تھا جو اس حملے میں بچ گیا۔ لگتا ہے کہ کچھ عرصہ بعد اکبر کو بھی احساس ہو گیا کہ درباری سازشوں کا شکار ہو کر اس نے بیرم خان کے ساتھ زیادتی کی ہے کیونکہ بعد میں اُس نے بیرم خان کے بیٹے عبد الرحمن کو اعلیٰ عہدے پر فائز کر دیا۔

بیرم خان کو ہٹوانے کے بعد ماہم انگا نے دو سال تک ہندوستان پر بے تاج حکومت کی جس کے بعد حکومت کی باگ دوڑ اکبر نے خود سنبھال لی۔

اکبر کا ہندوستان

اکبر ایک سمجھدار اور وسیع النظر بادشاہ تھا۔ اُس نے اپنے آپ کو مسلمانوں کے بادشاہ کے بجائے پاک وہند کے تمام لوگوں کا بادشاہ بنایا۔

اسی نظریئے سے اُس نے 1562ء میں امبر کی راجپوت شہزادی جودھا بائی سے شادی کی اور راجپوتوں کو احساس دلایا کہ مغل حکومت کوئی غیروں کی نہیں اُن کے اپنے ہی ہندوستانیوں کی ہے۔

بعد میں اکبر نے اور کئی راجپوت شہزادیوں سے بھی شادیاں کیں۔

اکبر نے ہندوستان میں نہ صرف غیر مسلموں پر جزیہ ٹیکس ختم کر دیا بلکہ مندروں کی یاترا پر جو ٹیکس عائد تھا وہ بھی ختم کر دیا۔

اس کے علاوہ اکبر نے یہ بھی اعلان کیا کہ آئندہ سے جنگ جیتنے کے بعد مردوں، عورتوں اور بچوں کو غلام بھی نہ بنایا جائے گا۔

اکبر بہت سمجھدار، قابل اور رحمدل بادشاہ تھا مگر اس کا یہ مطلب بالکل نہیں کہ وہ جنگجو یا سخت نہ تھا۔ جب میواڑ کے راجہ نے اکبر کی اطاعت کرنے سے انکار کر دیا تو اکبر نے خود فوج کے ساتھ اُس پر چڑھائی کر دی اور تیس ہزار لوگوں کا قتلِ عام کیا۔

27 سال کی عمر تک اکبر بے اولاد تھا۔ اولاد کے لئے اُس نے اپنے دارالحکومت آگرہ سے بیس میل دور سیکری کے مقام پر چشتیہ سلسلے کے صوفی شیخ سلیم کے پاس جانا شروع کیا اور اُن سے دعا کروانی شروع کی۔ ایک سال بعد اکبر کے ہاں مہارانی جودھابائی کے بطن سے شہزادہ پیدا ہوا۔ اکبر نے نہ صرف بچے کا نام شیخ سلیم کے نام پر سلیم رکھا بلکہ سیکری کے مقام پر ایک عالی شان شہر بسایا جس کا نام "فتح پور سیکری" رکھا اور آگرہ سے بہت سی عوام کو زبردستی یہاں لا کر بسایا۔ مگر پانی کی کمی کی وجہ سے کچھ ہی عرصے بعد اس شہر کو خیر آباد کہنا پڑا۔ فتح پور سیکری 15 سال تک اکبر کا دارالحکومت رہا۔

اکبر کا وزیر خزانہ ایک بہت قابل ہندو راجہ ٹوڈر مَل تھا۔ اکبر کے زمانے میں ٹیکس کی شرح 33٪ تھی۔ مگر قحط وغیرہ کے دنوں میں چھوٹ دی جاتی تھی۔ چونکہ مالیہ کا نظام ہندو وزیر کے ماتحت تھا اس لئے بہت سے افسر ہندو تھے اور وہ ٹیکس لینے میں اپنے ہم وطنوں اور ہندوئوں سے نرمی برتتے تھے جس سے اکبر بھی خوش تھا۔

یہ راجہ ٹوڈر مَل ہی کی دُور اندیشی تھی کہ اُس نے تمام درباری کام ہندی سے فارسی میں کر دیا۔ چونکہ وزارتِ مال میں زیادہ تر ہندو تھے لہٰذا اُنہیں اس حکم سے مجبوراً

فارسی سیکھنی پڑی اور اس طرح وہ بادشاہ کے دربار کی زبان سیکھ گئے اور ہندوستانیوں کی بادشاہ کے قریب ہونے اور دربار میں اثر ورسوخ حاصل کرنے کی شروعات ہوئیں۔

اکبر کے زمانے میں پاک وہند میں لوگ بہت خوشحال تھے۔ ایسی خوشحالی ہندوستان نے آنے والی کئی صدیاں پھر نہ دیکھی۔

اکبر کے افسران بھی اتنی زیادہ تنخواہ پاتے تھے کہ شاہانہ طور پر رہتے تھے۔ افسران کا انداز زیادہ شاہانہ اس لئے بھی ہوتا کہ افسر کی موت پر اُس کا منصب اور تمام جاگیر و جائیداد وغیرہ بادشاہ کے قبضے میں آجاتی تھی جسے وہ اگلے افسر کو دے دیا کرتا تھا۔ لہٰذا پیسہ جمع کرنے کے بجائے خرچ کرنے کا رواج عام تھا۔

ہندوئوں کے درمیان جھگڑوں کا فیصلہ اُن کے شاستروں اور دیگر مذہبی کتب کے مطابق برہمن یا گائوں کی پنچایت کیا کرتی تھی جبکہ مسلمانوں کے درمیان تنازعات شریعہ کے تحت قاضی فیصلہ کیا کرتے تھے۔

ہندوئوں اور مسلمانوں دونوں کے فیصلوں کے خلاف بادشاہ کو اپیل کی جا سکتی تھی جس کا فیصلہ حرفِ آخر ہوا کرتا تھا۔

اکبر نے پاک وہند کی معیشت سنوارنے کے لئے بھی نہایت عمدہ پالیسیاں اختیار کیں۔

کشمیر، ایران اور دوسرے علاقوں سے عمدہ کاریگروں کو لا کر لاہور، آگرہ اور احمد آباد بسایا گیا اور اُن سے قالین بافی، شال بافی اور ملبوسات کے کارخانے قائم کروائے گئے۔ نہ صرف یہ بلکہ اکبر نے اپنے امراء اور عہدہ داروں کو مجبور کیا کہ وہ بھی انہی کارخانوں کی اشیاء استعمال کیا کریں۔ ان سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ پاک وہند میں بہت

سی صنعتیں قائم ہو گئیں جو صدیوں تک یہاں کی معیشت پر بڑے مثبت اثرات مرتب کرتی رہیں۔

اکبر کے زمانے میں پاک و ہند سے مصالحہ، خوشبویات، کشمیری قالین، کشمیری شالیں اور افیم دنیا کے مختلف ملکوں میں بھیجی جاتی تھیں اور بہت مقبول تھیں۔ ہندوستان کا سوت (کاٹن) کا کپڑا آدھی سے زیادہ دنیا میں بے حد مقبول تھا اور اُس کی مانگ اتنی زیادہ تھی کہ دنیا کے ہر ملک میں ہاتھوں ہاتھ بکتا۔ گجرات کا سوتی (کاٹن) کپڑا تو ساری دنیا میں اس قدر بکتا تھا کہ کہا جاتا تھا کہ افریقہ اور ایشیا میں سوتی کپڑا صرف گجراتی ہی پہنا جاتا ہے۔

اُس زمانے میں یورپ میں بھی ہندوستانی کاٹن کے کپڑے کی بہت مانگ تھی۔ یہ نہ صرف باقی دنیا کے کپڑے سے بہت عمدہ تھا بلکہ سستا بھی تھا۔ قیمت کم ہونے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اُس وقت بھی ہندوستانی مزدور ایک یورپی مزدور کے مقابلے میں سات گنا کم معاوضہ لیتا تھا۔

اکبر کا دینی رجحان

سولہویں صدی کے اواخر میں ہندوستان میں یہ بات عام تھی کہ ظہورِ اسلام کو ایک ہزار سال ہوا چاہتے ہیں اور اب کسی بھی وقت امام مہدی کا ظہور ہونے والا تھا۔

اکبر اپنی جوانی میں اتنا کٹر مسلمان تھا کہ پانچ وقت کی نماز باجماعت ادا کرتا، اذان دیا کرتا، اکثر نماز کی امامت کرواتا اور مسجد میں جھاڑو دیا کرتا تھا۔

انہی مذہبی جذبات کے تحت اُس نے صوفی بزرگ شیخ سلیم چشتی کے ہاں حاضری دینا شروع کی اور پھر ہندوستان کا دارالخلافہ ہی آگرہ سے اُٹھا کر صوفی بزرگ

کے قدموں میں فتح پور سیکری لے آیا۔

یہ انہی مذہبی جذبات کا کرشمہ تھا کہ اُس نے صوفی بزرگ شیخ سلیم چشتی کی خانقاہ کے قریب ہی 1575ء میں ایک عظیم عمارت عبادت خانہ کے نام سے تعمیر کروائی جس کا مقصد یہ تھا کہ علمائے کرامِ سے اسلام کا فیض حاصل کیا جائے۔

اکبر صوفیوں اور درویشوں کا بڑا معتقد تھا۔ وہ صوفیانہ کلام بڑے شوق سے سنا کرتا۔ خاص طور پر وہ جلال الدین رومی کا کلام بڑی عقیدت سے سنتا اور اس دوران اکثر اُس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو جایا کرتے تھے۔

عبادت خانے میں علمائے کرام نے اکبر کو اسلام کا علم پہنچانے کے بجائے اُسے اپنے چھوٹے پن سے گمراہ کر دیا۔

ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لئے علمائے اسلام نے ایسے ایسے فتوے دیئے کہ اکبر کا مذہبِ اسلام سے دل کھٹا ہو گیا۔ مثلاً اگر ایک عالم ایک چیز کو حرام کہتا تو دوسرا اُسے نیچا دکھانے کے لئے عجیب و غریب تاویلیں نکال کر اُسی چیز کو حلال قرار دے دیتا۔

اکبر کی چار سے زیادہ بیویاں تھیں۔ عبادت خانہ میں علماء نے یہ تذکرہ چھیڑ دیا کہ یہ حرام ہے۔ اُن علماء کو نیچا دکھانے کے لئے دوسرے علماء نے کہا کہ یہ متعہ کے تحت حلال ہے۔ پہلے علماء نے کہا کہ بادشاہ حنفی فقہ کا قائل ہے متعہ نہ کر سکتا ہے۔ دوسرے علماء نے کہا کہ اگر مالکی فقہی متعہ کے حق میں فتویٰ دے دیں تو ایک حنفی کے لئے بھی متعہ جائز ہو جائے گا۔ چنانچہ مالکی عالم نے فوراً فتویٰ صادر فرمایا اور بادشاہ کی شادیاں حرام سے حلال قرار پائیں۔

اس کے علاوہ شیعہ اور سُنّی علماء بھی ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لئے نہایت فضول باتیں بادشاہ کے سامنے عبادت خانہ میں کیا کرتے۔ خاص طور پر بعض شیعہ علماء چند صحابہ کرامؓ کے بارے میں ایسی ایسی نازیبا گفتگو کرتے کے مذہبِ اسلام پر سے بادشاہ کا اعتبار اُٹھنے لگتا مگر چونکہ اتنے جید علماء یہ باتیں کرتے تو اکبر اُن کو نظر انداز بھی نہ کر سکتا تھا۔ اسی وجہ سے اکبر نے اسلام کے آغاز کی تاریخ بھی پڑھوا کر سنی مگر وہاں بھی ایسی ایسی باتیں مختلف فرقوں کی تواریخ میں لکھی تھیں کہ اکبر کا ایمان مزید کمزور ہو گیا۔

اکبر کے زمانے کے کئی صوفی علماء بھی میدان میں آگئے اور وحدت الوجود کے فلسفے اور ابنِ عربی کی تحریروں سے ایسی ایسی تاویلیں گھڑیں کے بادشاہ کو انسانِ کامل قرار دے کر اُس کے لئے سجدئہ تعزیمی کو لازم قرار دے دیا۔

اس سے اکبر کو دین ایک موم کی ناک دکھائی دینے لگا جسے کسی طرف بھی موڑا جا سکتا تھا۔ لہٰذا اکبر اس نتیجے پر پہنچا کہ تمام مذاہب برابر ہیں کیونکہ ہر مذہب کی بنیاد سچائی پر ہے اور ہر دین سے عقل اور ضرورت کے مطابق احکام مستعار لئے جا سکتے ہیں۔

اکبر کے زمانے میں سب سے جید اور مشہور علمائے دین مخدوم الملک اور صدر الصدور تھے۔

مخدوم الملک اسلامی علوم کے ماہر اور عظیم عالم، مگر بہت گھٹیا انسان تھے۔ وہ بڑے رشوت خور تھے اور اپنے مخالفین پر جھوٹی تاویلیں بنا کر فتوے صادر کیا کرتے اور اُنہیں مروا ڈالتے تھے۔ اُن کی موت پر اُن کے گھر سے تین کروڑ روپے نقد برآمد

ہوئے۔

اکبر کے زمانے کے دوسرے مشہور عالم صدرالصدور تھے جو بہت بڑے عالم تھے مگر اُن کے چیلے رشوت لیتے تھے کیونکہ مسجدوں کے اماموں کو جاگیریں صدرالصدور کے دستخط سے ملتی تھیں۔

مخدوم الملک اور صدرالصدور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش میں رہتے اور عبادت خانے کی بحثوں میں ایک دوسرے پر پھبتیاں کستے۔ مخدوم الملک نے فتویٰ دیا کہ صدرالصدور کے پیچھے نماز جائز نہیں کیونکہ اُسے خونی بواسیر ہے۔ جس پر صدرالصدور نے اعلان کیا کہ مخدوم نہ صرف جاہل ہے بلکہ کافر بھی ہے۔

دینِ الٰہی

اکبر کی مذہب میں مداخلت بھی دراصل علماء دین کی ناسمجھیوں کا نتیجہ تھی۔ علماء نے کوشش کی کہ ہر بات پر کسی نہ کسی طرح کوئی تاویل گھڑ کر فتویٰ لگا دیا جائے تاکہ حکومت کا ہر کام اُن کی اجازت سے ہو اور وہ حکومت کا سب سے طاقتور گروہ بن جائیں جبکہ اکبر اپنی حکومت علماء کے پاس گروی رکھوانے کے لئے کسی طرح تیار نہ تھا۔ لہٰذا اُس نے اُن کی ناجائز طاقت توڑنے کا یہ طریقہ نکالا کہ مذہبی طاقت ہی بادشاہ میں مرکوز کر دی جائے، اور یہ طریقہ بڑا کارآمد رہا۔

سب سے پہلے علماء کی لڑائیوں اور بے سبب فتوئوں اور حکومت میں مداخلت کو روکنے کے لئے ابوالفضل اور فیضی کے والد شیخ مبارک نے اُسے مشورہ دیا کہ وہ مجتہد ہونے کا اعلان کر دے۔ چنانچہ بڑی آیتوں اور روایتوں کی اسناد کی بنیاد پر ایک فتویٰ تحریر کیا گیا کہ بادشاہِ وقت مجتہدِ اعظم ہوتا ہے اور اس فتوے پر وقت کے تمام بڑے

علماء کرام نے اپنی مہریں ثبت کیں ۔ اس طرح اکبر نے مذہب کے بارے میں مختلف احکام دینے شروع کردیئے۔

اپنی حکومت کے اٹھارہویں سال میں اکبر نے ریاست گجرات فتح کی اور اس طرح پہلی بار اُس کا سابقہ پرتگالیوں سے پڑا جو اکبر کی زندگی کے پہلے یورپی لوگ تھے۔

آہستہ آہستہ عبادت خانہ میں مختلف مذہبوں کے مذہبی پیشوا بھی آنے لگے جو بحث ومباحث کرتے اور اکبر اُن سے مختلف سوالات کرتا۔ ان میں مسلمان، ہندو، جین، پارسی، سکھ اور پرتگالی پادری شامل ہوتے۔

اکبر بہت ذہین شخص تھا اور ذہین اور پڑھے لکھے لوگوں کو بہت پسند کرتا تھا۔

مذاہب میں اکبر کی خاصی دلچسپی تھی اور وہ مسلم، ہندو، بدھ، جین، پارسی، سکھ اور مسیحی علماء کو اکثر اپنے دیوانِ خاص میں بلا کر اُن کی بحثیں سنا کرتا تھا۔

اپنی رعایا میں سے مذہبی لڑائیاں ختم کرنے کے لئے اکبر نے ''دینِ الٰہی'' کے نام سے ایک نیا دین رائج کیا جو اسلام، ہندو مت، بدھ مت، جین مت، آتش پرستی، سکھ مت اور مسیحیت کا مجموعہ تھا۔ اس مذہب میں سلام کے طور پر لوگ ''اللہ اکبر'' کہا کرتے تھے۔

عبادت خانہ میں ہونے والی بحثوں میں اکبر خیال رکھتا کہ کسی بھی وجہ سے انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے اور کسی بھی مذہب یا فرقے کے عالمِ دین کو قابلیت سے زیادہ پذیرائی نہ ملے۔ لہٰذا کئی بار ایسا ہوتا کہ دوسرے مذاہب کے عالم یا غیر سُنّی فرقہ کے عالم ایسی دور اندیشی کی باتیں کرتے، دلیلیں دیتے یا کہاوتیں سناتے کہ اکبر عش عش کر اُٹھتا اور درباری علماء کو خفت اُٹھانی پڑتی۔ چنانچہ درباری علماء عبادت خانہ

میں ہونے والی بحثوں کے خلاف افواہیں پھیلاتے رہتے کہ وہاں فقط کفر ٹُلتا ہے۔ ان سازشوں کی وجہ سے بہت سے سرداروں نے عبادت خانہ کی بحثوں کو بہانہ بنا کر اعلانِ بغاوت کر دیئے۔ مگر اکبر نے ہتھیار ڈالنے کے بجائے اُٹھا لئے اور تمام باغیوں پر فوج کشی کر کے اُنہیں سرکوب کیا۔ ان بعاوتوں کو کچلنے کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ اب اکبر کے دینی رجحانات پر حرف اُٹھانے کی کسی میں جرأت نہ رہی ۔ لہٰذا 1582ء کے بعد اکبر نے شیخ مبارک اور اُس کے بیٹوں ابوالفضل اور فیضی کی مدد سے نئے مذہب "دینِ الٰہی" کی ترویج کا کام شروع کر دیا۔

شیخ مبارک ایک صوفی منش انسان تھے جن کے آباء یمن سے ہجرت کر کے آئے تھے۔ شیخ صاحب کا آگرہ میں ایک مدرسہ تھا اور اُن کے خیالات سے راسخ العقیدہ علماء اسلام خاصے خفا تھے۔

شیخ مبارک کے دو بیٹے ابوالفضل اور فیضی تھے۔ یہ دونوں اکبر کے نورتنوں میں شامل تھے۔ فیضی اکبر کا درباری شاعر تھا جبکہ ابوالفضل درباری عالم تھا۔

ابوالفضل کا دینِ الٰہی کی تخلیق اور ترویج میں بڑا ہاتھ تھا۔ دینِ الٰہی اکبر کے دربار کے باہر کوئی قبولیت نہ پا سکا۔ اکبر نے نہ کبھی نبوت کا دعویٰ کیا اور نہ کبھی اسلام یا حضرت محمدؐ کی شان میں بے ادبی کی۔

دراصل عبادت خانے میں بہت سارے علماء کا پول کُھل گیا تھا کہ وہ عقل اور علم سے عاری تھے اور بادشاہ کے عام سوالوں کے جواب بھی نہ دے سکتے تھے۔ مگر خفت مٹانے کے لئے وہ مشہور کرتے کہ بادشاہ دراصل دہریہ ہو گیا ہے یا اُس نے نبوت کا دعویٰ کر دیا ہے وغیرہ وغیرہ، اس لئے ہمارے جوابات نہیں مانتا۔

اکبر کے زمانے کے عینی شاہد تاریخ دان بہت سارے تھے مگر اُس کی مذہبی تاریخ کی تفاصیل ان میں سے صرف تین نے ہی رقم کی ہیں۔ یہ تھے ابوالفضل، بدایونی اور پرتگیزی پادری۔

بدایونی چونکہ بادشاہ کے خلاف تھا لہٰذا اُس نے اپنی تاریخ میں بے شمار ایسی باتیں لکھیں جو یہ تاثر دیتی ہیں کہ بادشاہ اسلام کے خلاف تھا اور ایک نیا مذہب بنا کر اُس نے نبوت کا دعویٰ کر دیا تھا۔ لیکن اُس کی بہت ساری ایسی باتیں جب دوسرے تاریخ دانوں کے واقعات کے ساتھ ملا کر پڑھی جائیں تو غلط ثابت ہوتی ہیں۔

بعد کے بہت سے تاریخ دانوں نے تحقیق کے بغیر بدایونی کی سب باتوں کو سچ مان کر تاریخ کی کتب لکھ ڈالیں۔ دوسری طرف پرتگیزی پادریوں کے خطوط تھے جو وہ گوا میں کمپنی کے افسروں کو بادشاہ کے متعلق لکھتے تھے۔ انگریز تاریخ دانوں کے لئے یہ خطوط سب سے اہم تاریخی دستاویزات ہیں۔ مگر تحقیق سے ثابت ہے کہ ان میں بھی بادشاہ کے مذہبی خیالات کے بارے میں بے شمار غلط باتیں لکھی تھیں۔

مثلاً جن دنوں کے متعلق انہوں نے لکھا کہ بادشاہ نے تمام مسجدیں اصطبل بنوادیں اور مسجدوں کی تعمیر پر پابندی عائد کروادی۔ دوسرے کئی لوگوں کی تحریروں سے ثابت ہے کہ انہی دنوں بادشاہ نے قلعہ میں مسجد تعمیر کروائی اور مختلف اوقات میں باجماعت نماز ادا کی۔

اکبر کے مذہبی خیالات اور احکامات کے بارے میں ابوالفضل کا بیان سب سے معتبر ہے جس سے ثابت ہے کہ اکبر کے مذہبی خیالات سیاسی تھے اور علماء کی نادانیوں کا نتیجہ تھے۔ جن کا اصل مقصد یہ تھا کہ رعایا کا کوئی بھی باشندہ اپنے آپ کو

بادشاہ سے علیحدہ نہ سمجھے۔ ہر مذہب کا ہندوستانی یہ خیال کرے کہ بادشاہ اُسی کے مذہب کا ہے۔

تزکِ جہانگیری کے مطابق اکبر نے مرتے وقت کلمہءِ شہادت دہرایا، سورۃ یٰسین پڑھوا کر سنی اور بطور ایک پکّے مسلمان کے وفات پائی۔

اکبر کی وسیع النظری

اکبر ایک ذہین انسان تھا اور وہ زندگی کی حقیقت کو پانے کی تڑپ رکھتا تھا۔ اس سلسلے میں وہ صرف بحث و مباحثے پر ہی اکتفانہ کرتا بلکہ تجربات بھی کیا کرتا تھا۔ مثلاً اکبر کا خیال تھا کہ انسانی زبان ایک ہی ہے جو ہر انسان کی جبلت میں ہوتی ہے۔ لہٰذا اُس نے بیس نومولود بچے لے کر اپنے محل میں اس طرح پالے کہ اُن کے کان میں کوئی لفظ نہ پڑے۔ مگر چار سال گزرنے کے باوجود ان بچوں نے کوئی لفظ نہ بولا۔ چنانچہ یہ تجربہ ختم کر کے بچوں کو واپس اُن کے والدین کے پاس بھجوا دیا گیا۔

ابوالفضل کے مطابق اُس زمانے کی مشہور کتب میں سے شاید ہی کوئی کتاب ہو جو اکبر نے پڑھوا کر نہ سنی ہو۔ ان میں اخلاق، تاریخ، تصوف اور ادب کی کتابیں شامل تھیں۔ مثلاً کیمیائے سعادت، گلستان، بوستان، مثنوی مولانا روم، شاہنامہ، وغیرہ۔

اکبر نہ صرف فن تعمیر کا اعلیٰ ذوق رکھتا تھا بلکہ بذاتِ خود ایک مصور بھی تھا۔ اس کے علاوہ موسیقی میں اُس کے اعلیٰ ذوق کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ تان سین کو اپنا درباری موسیقار بنانے کے لئے اُس نے بہت تگ و دو کی۔

اکبر ایرانی ثقافت کا بڑا مداح تھا۔ مگر ساتھ ہی ساتھ وہ پاک و ہند کی ثقافت کو بھی بہت پسند کرتا تھا۔ لہٰذا جہاں اُس نے فارسی زبان اور فارسی طرزِ تعمیر اور فن کی

پذیرائی کی وہیں پر ہندی، ہندوستانی سنگیت اور طرزِ تعمیر اور فن کی بھی بہت ترویج کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان دونوں بڑی ثقافتوں کا میل عمل میں آیا جس سے صحیح معنوں میں مغلیہ ثقافت کی شروعات ہوئی جو آنے والی صدیوں میں بہت پروان چڑھی۔

اکبر کتابوں کا بے حد شوقین تھا اور اکثر کتابیں پڑھوا کر سُنا کرتا۔ اس طرح اپنی بے پناہ یادداشت کے باعث وہ اکثر پڑھے لکھے لوگوں سے زیادہ علم رکھتا تھا۔

اکبر نے کثیر مالیت سے ایک عظیم الشان کتب خانہ بنا رکھا تھا جس میں کم از کم چوبیس ہزار کتب موجود تھیں۔

اکبر نے پرتگالی پادریوں کو مسیحیت کی تبلیغ کی اجازت دے رکھی تھی۔ اُس نے یہ بھی کہہ رکھا تھا کہ اُس کے اپنے بیٹوں میں سے بھی اگر کوئی شہزادہ کوئی اور دین اپنانا چاہے گا تو وہ اُسے روکے گا نہیں۔

اکبر اور شہزادہ سلیم دونوں ہی حضرت مریم کے مجسّمے کی بڑی تعظیم کیا کرتے تھے جس کا مقصد یہ تھا کہ اکبر پرتگیزیوں کو خوش کر کے اُن سے توپیں لے جب کہ شہزادہ سلیم اکبر کے خلاف بغاوت میں پرتگالیوں کی مدد چاہتا تھا۔

اکبر کے دورِ حکومت میں پاک وہند بلاشبہ دنیا کی امیر ترین سلطنت تھی اور اس کے شہری دنیا کے خوشحال ترین لوگ تھے۔

اکبر کے جانشین

سلیم کے علاوہ اکبر کے دو اور بیٹے تھے، مراد اور دانیال۔ مگر قضاء الٰہی سے یہ دونوں شہزادے اکبر کی موت سے چند سال پہلے ہی وفات پا گئے۔ ان دونوں شہزادوں کی موت کی وجہ کثرتِ شراب نوشی تھی۔

1601ء میں شہزادہ سلیم نے بغاوت کر کے بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ اکبر نے سلیم کی بغاوت کچلنے کے لئے اپنا جرنیل ابوالفضل بھیجا جسے راستے ہی میں سلیم کے آدمیوں نے قتل کر دیا۔

1605ء میں سلیم نے خفیہ طور پر اکبر کو زہر دلوا دیا جس سے اُس کی موت واقع ہو گئی۔ اکبر کا جنازہ جلدی میں کیا گیا اور کوئی بہت بڑا جنازہ نہ تھا۔

نوّے سال بعد شہنشاہ اورنگزیب کے خلاف بغاوت کے دوران جاٹ لوگوں نے آگرہ کے قریب واقع اکبر کے مقبرے کو لوٹ لیا اور اُس کی ہڈیاں نکال کر آگ میں پھینک دیں۔

اکبر کی سلطنت اپنے وقت کی دنیا کی طاقتور ترین سلطنت تھی ، جس کی مثال ہندوستان کی تاریخ میں نہیں ملتی۔

☆☆......☆☆

چھٹا باب

یورپی، سکھ اور مرہٹے

(1500ء سے 1800ء)

یورپی

سولہویں اور سترہویں صدی عیسوی میں ہندوستان کے خزانے سونے سے اُبلے پڑتے تھے۔ یہ زمانہ ہندوستان میں تاج محل، تختِ طاؤس اور کوہِ نور کا زمانہ تھا۔ یہ وہ دور تھا جب ہندوستان اپنی دولت کے لئے، اپنے راجاؤں کے لئے اور علم و ادب کی پذیرائی کے لئے ساری دنیا میں مشہور تھا۔ اُن دنوں افغانستان، ایران، ترکی یا وسطی ایشیا میں جہاں کہیں بھی کسی فارسی زبان کے شاعر، ادیب، گائیک یا مصور کو لگتا کہ اُس نے اپنے فن میں ملکہ حاصل کر لیا ہے تو وہ سیدھا ہندوستان کا رُخ کرتا اور کسی نہ کسی ہندوستانی دربار میں جگہ پاتا۔

مغل بادشاہ عظیم الشان فوج بھی رکھنے کے عادی تھے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ آس پاس کا کوئی ملک ہندوستان پر حملے کا نہ سوچتا۔ اِدھر ہندوستان میں دولت کی اتنی ریل پیل تھی کہ یہاں سے باہر جانے کی کبھی کسی بادشاہ نے ضرورت ہی محسوس نہ کی تھی۔ اندرونی بغاوتیں بھی کوئی ایسی نہ رہی تھیں جو سلطنت کے لئے کوئی بڑا خطرہ

ثابت ہوتیں۔ چنانچہ خوشحالی کے اس دور میں علم و فن میں تو خوب ترقی ہوئی مگر جنگ و جدل کے طریقوں اور ہتھیاروں میں تبدیلی یا ترقی کی کوئی خاص ضرورت محسوس نہ کی گئی۔

دوسری طرف یورپ میں ان دنوں زیادہ تر جہالت کا زور تھا۔ چرچ نہ صرف لوگوں پر کُفر کے فتوے لگا کر اُنہیں زندہ جلا دینے کی سزائیں دیتا بلکہ بادشاہوں کو اجازت دیتا کہ وہ خدا کے نام پر دوسرے ملکوں پر حملے کریں، وہاں قتلِ عام اور لوٹ مار کریں اور اپنا قبضہ ہی جمالیں۔ عمومی طور پر اُس زمانے میں یورپی عوام بد تہذیب، جاہل اور غریب جبکہ حکمران ظالم و جابر تھے۔ ریاستیں نہ صرف غیر یورپی ممالک پر حملے کرتی رہتیں بلکہ آپس میں بھی لڑتی رہتیں۔ چنانچہ اس دور میں یورپ نے جنگی تدابیر اور ہتھیاروں میں بڑی زود اثر تبدیلیاں کیں اور ترقی پائی۔

یورپیوں کے لئے ہندوستان ایک خزانہ تھا۔ یہاں کے کپڑوں اور قالینوں کے علاوہ مصالحہ جات کی بھی یورپ میں بڑی مانگ تھی۔ یورپی جب ہندوستان آئے تو انہوں نے دیکھا کہ یورپ ساز و سامان، مال و دولت اور تہذیب و تمدن میں ہندوستان سے پیچھے مگر اسلحے میں بہت آگے تھا۔ تجارت نے زور پکڑا تو معلوم ہوا کہ ہندوستان میں صرف یورپی اسلحے کی مانگ تھی جبکہ ہندوستان سے بے شمار ساز و سامان یورپ جاتا تھا۔

یورپیوں نے دیکھا کہ اُن کے جدید اسلحے کی نمائش کرنے سے ہندوستانی سامان سستا دیتے تھے۔ لہٰذا آہستہ آہستہ انہوں نے تجارت میں اپنی جنگی صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ شروع کر دیا۔

پرتگال

پندرہویں صدی تک ہندوستان یورپی ممالک میں رہنے والے لوگوں کے لئے کوہِ قاف جیسی جاذبیت رکھتا تھا۔ اس کی ایک خاص وجہ یہ تھی کہ یورپ سے ہندوستان پہنچنا اُن دنوں بڑا جان جوکھوں کا کام تھا۔ پہلی مشکل یہ تھی کہ دونوں سرزمینوں میں فاصلہ بہت تھا اور دوسری مشکل یہ تھی کہ یورپ سے ہندوستان تک کا بحری راستہ دریافت نہ ہوا تھا۔ سونے پہ سہاگہ یہ ہوا کہ افریقہ، مشرق وسطیٰ، وسطی ایشیا اور ایشیائے کوچک پر مسلمانوں کی حکومت ہو گئی۔ نتیجتاً سکندرِ اعظم کے بعد یورپ اور ہندوستان کا زمینی رابطہ محال ہو گیا۔ سمندری رابطے کی کوششیں تب زور پکڑ گئیں جب سمندری راہوں پر سے مسلمانوں کا تسلط ختم ہوا اور یورپی اقوام نے سمندروں پر راج کرنا شروع کر دیا۔

1490ء کی دہائی میں یورپ نے مغرب میں امریکا اور مشرق میں ہندوستان کا بحری رستہ دریافت کیا۔ 1498ء میں جب پرتگالی مہم جو واسکوڈے گاما ہندوستان کی جنوبی ریاست کیرالہ پہنچا تو اُس کے ساتھ کئی بحری جہاز تھے جن میں وہ ہندوستانی سامان بھر کر لے گیا۔ یورپ میں ہندوستانی سامان کی اس قدر مانگ تھی کہ سو روپے کی خریدی ہندوستانی چیز واسکوڈے گاما نے یورپ لے جا کر چھ ہزار روپے کی بیچی۔ اس وقت تک ہندوستان میں مغل حکومت کا آغاز نہ ہوا تھا اور دہلی پر سکندر لودھی کی حکومت تھی۔

پرتگال کا اسلامی نام الغرب الاندلس یعنی اندلس کا مغربی علاقہ تھا۔ پرتگال اور اندلس کے علاقے طارق بن زیاد نے 711ء میں فتح کئے تھے، جس کے بعد پرتگال پر 1249ء تک اور اندلس پر 1492ء تک مسلمان حکمران رہے۔ 1510ء میں

پرتگال نے بیجاپور کے مسلمان حکمران کو شکست دے کر گوا کے شہر پر قبضہ کر لیا۔ اس فتح کے نتیجے میں گوا کے مسلمانوں کو چُن چُن کر قتل کیا گیا۔

برازیل ایک چھوٹا سا ملک ہے جس کی موجودہ آبادی بھی محض ایک کروڑ کے لگ بھگ ہے۔ اُس زمانے میں یہ آبادی بہت ہی کم تھی اور اُس پر یہ کہ پرتگال نے برازیل کے وسیع و عریض ملک پر بھی قبضہ کر رکھا تھا۔ اب ہندوستان کے علاقوں پر بھی قبضہ کرنے کے بعد پرتگال میں مسئلہ ہو گیا کہ اتنے پرتگالی کہاں سے لائے جائیں جو تمام علاقوں پر پرتگال کا قبضہ بحال رکھ سکیں۔ اسی تگ و دو میں پرتگالی افسروں نے اپنے ماتحتوں کی ہندوستانی عورتوں سے شادیوں کی حوصلہ افزائی کی۔ یہ اسی حوصلہ افزائی کا نتیجہ تھا کہ گوا اور اس کے اطراف میں پرتگالی باپوں اور ہندوستانی مائوں کے بچوں کی ایک پوری نسل پیدا ہو گئی۔

ہندوستان میں آلو، مکئی اور تمبا کو متعارف کروانے والے پرتگیزی ہی تھے۔

ولندیزی

پرتگالیوں کے بعد یورپ سے ولندیزی آئے جنہوں نے مدراس اور بنگال میں تجارتی گودام تعمیر کئے۔ ولندیزی ہندوستان میں زیادہ کامیابی نہ حاصل کر سکے اور اپنی تجارت انگریزوں کو بیچ کر انڈونیشیا میں قسمت آزمائی کرنے نکل کھڑے ہوئے۔

ڈنمارک

ولندیزیوں کے بعد ہندوستان میں اہلِ ڈنمارک آئے اور 1616ء میں بنگال میں اپنے قدم جمائے۔ یہاں پر انہوں نے ایک چھاپہ خانہ بھی تعمیر کیا۔ مگر یہ لوگ بھی یہاں بس نہ سکے اور 1845ء میں اپنا کاروبار انگریزوں کو بیچ کر چلتے بنے۔

انگریز

برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام سے 1600ء میں برطانیہ کے تاجروں نے ایک تجارتی کمپنی کا سنگِ بنیاد رکھا۔ اس کمپنی کا مقصد مشرقی ممالک کے ساتھ تجارت کرنا تھا۔ کمپنی ہندوستان جیسے امیر اور ترقی یافتہ ملک کے ساتھ تجارت کرنے کے لئے تڑپ رہی تھی مگر یہاں پر پرتگیزی اُسے جمنے نہ دیتے تھے۔ چار و ناچار کمپنی نے اپنے بادشاہ جیمز اول سے درخواست کی کہ وہ کمپنی کو شہنشاہِ ہندوستان سے تجارت کی خاص اجازت لے کر دے۔ چنانچہ شاہِ برطانیہ نے 1612ء میں اپنا سفیر سر تھامس رو شہنشاہ جہانگیر کے دربار میں بھیجا۔ جہانگیر نے جیمز کی درخواست قبول کی اور کمپنی کو ہندوستان میں تجارت کرنے اور گودام بنانے کی خاص الخاص اجازت عطا کی۔ چنانچہ 1619ء میں کمپنی نے سورت کے مقام پر اپنے تجارتی گودام تعمیر کر لئے۔

1639ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے مدراس میں قدم جمالئے۔ 1668ء میں کمپنی کی ایک اور لاٹری نکل آئی۔ بمبئی پرتگیزیوں کے قبضے میں تھا۔ پرتگیزی شہزادی کی شادی انگریز بادشاہ سے ہو گئی اور وہ جہیز میں بمبئی بھی لے آئی۔ انگریز بادشاہ نے بمبئی کمپنی کو دس پائونڈ سالانہ کے عوض کرائے پر دے دیا۔ کمپنی نے ہندوستان میں وہ لُوٹ مار مچائی کہ معیشت کے انگریز باوا آدم ایڈم سمتھ کو بھی کہنا پڑ گیا کہ کمپنی کا اصل کاروبار ہندوستان کو لُوٹنا ہے۔

فرانسیسی

فرانسیسی ہندوستان میں وارد ہونے والی آخری یورپی فوج تھی۔ فرانس میں تجارتی کمپنی 1669ء میں بنائی گئی۔ ہندوستان میں انگریزوں کے علاوہ اگر کسی یورپی

قوم کے قدم جمانے کا امکان تھا تو وہ فرانسیسی تھے۔ مگر پوری اٹھارہویں صدی کی تگ و دو کے بعد انگریز فاتح قرار پائے جبکہ فرانسیسی اپنے وطن واپس سدھارے۔

انگریزوں اور فرانسیسیوں کی ہمسائے ہونے کی بناء پر جنگ وجدل جاری رہتی تھی۔ اسی جنگ وجدل کا شاخسانہ تھا کہ اپنے ملکوں سے باہر بھی جب دونوں قوموں کا سامنا ہوتا تو یہ لڑنا شروع کر دیتیں۔ یہی وجہ تھی کہ جب امریکہ میں برطانیہ سے آزادی کی جنگ شروع ہوئی تو فرانس نے اپنی فوجیں امریکہ بھیجیں جو جا کر امریکنوں کے ساتھ انگریزوں کے خلاف لڑیں جس کے نتیجے میں 1776ء میں امریکہ نے برطانیہ سے آزادی حاصل کر لی۔ آزادی کے تحفے کے طور پر فرانس نے امریکہ کو مجسمہء آزادی بھیجا جو آج بھی امریکہ کے ساحل پر آویزاں ہے اور امریکی آزادی اور خودمختاری کی عالمی علامت بن چکا ہے۔

اسی طرح جب ہندوستان میں انگریزوں اور ریاست میسور کے بادشاہ ٹیپو سلطان کی جنگیں شروع ہوئیں تو فرانسیسیوں نے ٹیپو سلطان کی فوج کو نہ صرف جدید اسلحہ و توپ خانہ فراہم کیا بلکہ جدید فوجی تربیت بھی فراہم کی۔ ایک موقع پر تو ٹیپو سلطان نے فرانسیسی بادشاہ نپولین بوناپارٹ کو مدد کے لئے خط بھی لکھا تھا جس پر نپولین نے ہندوستان آکر سلطان کی مدد کا ارادہ بھی کر لیا تھا مگر اسی اثناء میں 1799ء میں سلطان ٹیپو انگریزوں سے لڑتا شہید ہو گیا۔ اس کے بعد جب انگریزوں اور سکھوں کی جنگیں ہو رہی تھیں تو فرانسیسی رنجیت سنگھ کو بھی فوجی اسلحہ، توپ خانہ اور تربیت فراہم کرتے رہے مگر رنجیت سنگھ کی وفات کے بعد سکھ بھی جم کر نہ لڑ سکے اور آخرکار 1849ء میں پنجاب بھی انگریزوں کے قبضے میں چلا گیا۔ ان پے در پے شکستوں نے

فرانسیسیوں کے دل ہندوستان سے اُچاٹ کر دیئے۔ویسے بھی 1789ء کے انقلابِ فرانس اور اس کے بعد نپولین کی پے در پے جنگوں اور اُس کی موت کے بعد سیاسی حالات نے فرانس کی اندرونی مشکلات میں بہت اضافہ کر دیا تھالہٰذا فرانس نے آہستہ آہستہ ہندوستان میں دلچسپی لینی کم کر دی۔

ہندوستان کی پہلی انگریزی حکومت

بنگال کا نوعمر نواب سراج الدولہ بھی انگریزوں اور فرانسیسیوں کی باہمی چپقلش کی نذر ہو گیا۔فرانسیسیوں کے کہنے پر اس نے 1756ء میں 146 انگریز مردوں اور عورتوں کو گرفتار کر کے ایک تنگ و تاریک کوٹھڑی میں قید کر دیا۔گرمی اور دم گھٹنے سے اُن میں سے 123 لوگ مر گئے۔اس پر انگریزوں نے نواب پر حملہ کر دیا اور اپنی مختصر سی فوج سے نواب کی ساٹھ ہزار کی فوج کو جنگِ پلاسی میں شکست دے کر بنگال پر قبضہ کر لیا۔

بنگال کے ہندو ساہوکار پہلے ہی اس بیس سالہ جذباتی نواب سے تنگ تھے اور اُس کے ماموں میر جعفر کو نواب بنانا چاہتے تھے۔لہٰذا انہوں نے انگریزوں سے مل کر سراج الدولہ کے کئی افسر خرید لئے تھے۔چنانچہ جب جنگ ہوئی تو بیس گنا زیادہ فوج ہونے کے باوجود سراج الدولہ ہار گیا کیونکہ میر جعفر اور بِکے ہوئے افسروں کے دستوں نے اپنی ہی فوج سے بغاوت کر دی۔اس طرح اپنی مرضی کا نواب تعینات کر کے انگریز نے بنگال کی حکومت حاصل کر لی۔

سکھ

1984ء میں ہندوستانی وزیر اعظم اندرا گاندھی کو اُس کے سکھ محافظوں نے

اس لئے قتل کر دیا کہ اندرا گاندھی نے امر تسر کے گوردوارے پر فوج کشی کروادی تھی۔ یہ زمین 1557ء میں مغل شہنشاہ اکبر نے سکھوں کے چوتھے گرو کو گردوارہ بنانے کے لئے تحفے میں دی تھی۔

1605ء میں جب اکبرِ اعظم کا انتقال ہوا تو علمائے ہند نے سُکھ کا سانس لیا کیونکہ وہ اکبر کی صُلحِ کُل کی پالیسی سے بے حد نالاں تھے۔ علمائے دربار اکبر کے بیٹے جہانگیر کو بادشاہ بنانا چاہتے تھے جبکہ دربار کے ہندو امراء جہانگیر کے بیٹے خسرو کو بادشاہ بنانا چاہتے تھے۔ آخر کار جہانگیر علماء کی مدد سے تخت پر بیٹھنے میں کامیاب ہو گیا اور اُنہیں خوش کرنے کے لئے ہندوستان میں اسلام کی حفاظت کا بیڑہ بھی اُٹھالیا۔ اسی دوران میں شہزادہ خسرو باغی ہو کر آگرہ سے فرار ہو گیا۔ خسرو نے سکھوں کے پانچویں گرو "گروارجن" سے بھی ملاقات کی۔ گرو صوفی منش انسان تھے اُنہوں نے انسانی ہمدردی میں چھوٹی موٹی مدد کر دی۔ اس جرم کی پاداش میں 1606ء میں شہنشاہِ ہندوستان جہانگیر عادل نے گروارجن کو اذیتیں دے دے کر مروادیا۔

1669ء میں کسی نے اورنگزیب عالمگیر کو بتایا کہ ملتان، ٹھٹھہ اور بنارس میں ہندو عالم ویدوں کی تعلیم دیتے تھے جو بڑی مقبول تھی۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ ساری مغلیہ سلطنت سے ویدوں کے سکول اور مندر مسمار کر دیئے جائیں۔ اس حکم کے تحت بڑے پرانے، عظیم الشان اور مقدس مندر گرادیئے گئے جن میں سے کئی کی جگہ مساجد تعمیر کر دی گئیں۔ جزیہ جو اکبرِ اعظم نے منسوخ کر دیا تھا وہ اورنگزیب نے دوبارہ نافذ کر دیا۔

سکھوں کے نویں گرو "گرو تیغ بہادر" نے اورنگزیب کے غیر مسلم

ہندوستانیوں پر مسلسل ظلم و ستم سے تنگ آکر عَلمِ بغاوت بلند کر دیا۔ 1675ء میں انہیں اورنگزیب نے مروا دیا۔

دسویں اور آخری گرو "گرو گوبند سنگھ" نے سکھوں کو فوجی اصولوں پر استوار کیا اور اورنگزیب سے زبردست جنگ شروع کر دی۔ اورنگزیب کی وفات کے بعد انہوں نے بہادر شاہ اول عرف شاہ عالم کا ساتھ دیا۔ بعد میں ان کو ایک افغان نے قتل کر دیا۔ ان کے بعد سے سکھوں کے گرو اُن کا مقدس کلام "گرنتھ صاحب" چلی آرہی ہے۔

سکھ سلطنت اُسی سال معرضِ وجود میں آئی جس سال کرناٹکا کی ریاست میسور کا سلطان ٹیپو انگریزوں سے لڑتے ہوئے شہید ہو گیا تھا، یعنی 1799ء میں۔

سکھوں نے مرہٹوں اور ابدالی سے لڑتے لڑتے اچھی بھلی منظم فوج بنالی تھی۔ لہٰذا 1799ء میں رنجیت سنگھ کے لاہور پر قبضے کے ساتھ ہی خالصہ سلطنت کی بنیاد پڑ گئی جو 1849ء میں انگریزوں کے ہاتھوں ختم ہوئی۔ اپنے عروج پر خالصہ حکومت میں صوبہ خیبر، پورا پنجاب اور کشمیر شامل تھے۔

مرہٹے

مرہٹے ہندوستان کی جنوبی ریاست مہاراشٹرا کے علاقے دکن کے جنگجو لوگ تھے۔ یہاں کے لوگوں کی زبان، تاریخ، کھانا پینا، لباس اور ثقافت شمالی ہندوستان سے بے حد مختلف رہی ہے۔ آگرہ اور دہلی کے اکثر بادشاہوں کو یہ لوگ نہ مانتے تھے چنانچہ وہاں سے ان پر بار بار فوج کشی کی جاتی تھی۔ اکبر، جہانگیر، شاہ جہاں اور اورنگزیب، ان تمام مغل بادشاہوں نے یہاں فوج کشی کی۔

اورنگزیب کے زمانے میں مرہٹوں نے بغاوت کر دی اور سردار شواجی کی قیادت میں مرہٹا ریاست قائم ہوئی۔ اورنگزیب نے مرہٹوں کو حقارت سے پہاڑی چوہوں کا خطاب دیا اور اُن پر حملہ کر دیا۔ ان پہاڑی چوہوں سے جنگ کرتے 26 سال گزر گئے مگر دکن فتح نہ ہو سکا۔ اورنگزیب نے یہ 26 سال اپنی پوری فوج کے ساتھ دکن میں حالتِ جنگ میں گزارے جس پر اتنا خرچہ آیا کہ مغلیہ سلطنت دیوالیہ ہو گئی۔

آخر کار اپنی موت سے دو سال پہلے 1705ء میں اورنگزیب اپنی فوج لے کر واپس دِلّی آ گیا۔ اس وقت وہ تقریباً نوّے سال کا ہو چکا تھا لہٰذا اُس نے اپنا وقت قرآن پڑھنے اور قرآن کے قلمی نسخے بنانے میں صرف کرنا شروع کر دیا۔ مغل فوج کی اس شکست سے مرہٹے مزید مضبوط ہو گئے اور اُن کے حوصلے پہلے سے بھی بلند ہو گئے۔

1707ء میں جب اورنگزیب فوت ہوا تو اُس کا بیٹا معظم تخت نشین ہوا۔ اس وقت اُس کی عمر کوئی 63 برس کے لگ بھگ تھی اور اس کے القابات میں بہادر شاہ اوّل اور شاہ عالم شامل تھے۔

1712ء میں جب شاہ عالم کی وفات ہوئی تو اُس کے چار بیٹوں میں تخت نشینی کی ایسی جنگ شروع ہوئی کہ پورے ایک ماہ تک باپ کی لاش بے گور و کفن پڑی رہی۔

ایک سال کی حکومت کے بعد شاہ عالم کے بیٹے کو اُس کے وزیر نے معزول کر کے اُس کے بھتیجے فرخ سیار کو بادشاہ بنا دیا۔ چند ہی سال بعد درباری امراء اس بادشاہ سے بھی تنگ آ گئے اور 1719ء میں اُسے حرم سے گھسیٹ کر لایا گیا اور زہر دینے سے پہلے اندھا کر دیا گیا۔

فرخ سیار کے خلاف بغاوت میں امراء کا ساتھ دینے پر مرہٹوں کو دکن میں

خود مختاری دے دی گئی۔ آہستہ آہستہ مرہٹے ہندوستان کی بڑی طاقت بننے لگے اور 1738ء تک وہ ہندوستان کی سب سے بڑی فوجی قوت بن چکے تھے۔

نادر شاہ

ایران کی صفوی حکومت پر افغانیوں نے حملہ کر دیا اور 1722ء میں اصفہان پر قبضہ کر لیا۔ 1736ء میں ایرانی جرنیل نادر شاہ درانی نے افغانوں کو مار بھگایا اور ایران پر اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔

1739ء میں نادر شاہ نے ہندوستان پر حملہ کر کے دِلّی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ بیشتر ہندو اور مسلمان مردوں کو قتل کر دیا گیا اور ایرانی افواج نے ہزاروں مقامی عورتوں کی عصمت دری کی جن میں ہندو یا مسلمان کی کوئی تمیز روا نہ رکھی گئی۔

جاتے جاتے نادر شاہ افغانستان کو ہمیشہ کے لئے ہندوستان سے علیحدہ کر کے لے گیا کیونکہ اس کے بعد افغانستان کبھی ہندوستان کا حصہ نہ بنا۔

احمد شاہ ابدالی

احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان پر کُل دس حملے کئے جن میں سے پہلا 1748ء میں کیا اور شکست کھائی۔ یہ حملہ نادر شاہ کے حملے کے محض نو سال بعد کیا گیا تھا۔

نادر شاہ کی موت کے بعد اُس کے افغان جرنیل احمد شاہ ابدالی نے افغانستان میں اپنی علیحدہ بادشاہت کا اعلان کر دیا اور پنجاب اور خاص طور پر لاہور پر بار بار حملے کر کے انہیں اتنی بار لُوٹا کہ یہاں پنجابی زبان میں محاورہ بن گیا ، "کھادا پیتا لاہے دا، باقی احمد شاہے دا" (جو کچھ کھا لو گے اور پہن لو گے وہی ملے گا باقی سب احمد شاہ لُوٹ کر لے جائے گا)۔

ابدالی نے 1756ء میں پھر حملہ کر کے دِلّی میں قتل وغارت گری کا بازار گرم کر دیا۔ نہ صرف بادشاہ اور امراء کو لُوٹا گیا بلکہ دہلی کے ہر گھر سے مالِ غنیمت اکٹھا کیا گیا۔ جس گھر سے مال کم ملا اُس گھر والوں پر اتنا تشدد کیا گیا کہ یا تو وہ مر گئے یا انہوں نے خودکشی کرلی۔ جہاں افغان فوجیوں کو خوبصورت عورتیں نظر آئیں، چاہے وہ ہندو تھیں یا مسلمان، اُنہیں ہندوستانی کنیزیں جان کر اُن کی عزت لُوٹ لی گئی۔ اس حملے میں لُوٹے گئے بے شمار مالِ غنیمت میں مغل دربار کی تمام خوبصورت مسلمان مگر ہندوستانی بہو بیٹیاں بھی شامل تھیں۔

1757ء میں ابدالی نے ہندوستان پر چوتھا حملہ کیا، ایک ماہ تک دِلّی میں قتلِ عام کیا، عصمت دری کا بازار گرم رکھا اور جو کچھ لوٹ سکتا تھا لوٹ کر لے گیا۔ اُدھر اسی سال بنگال میں انگریزوں نے جنگ پلاسی جیت کر نواب سراج الدولہ سے بنگال حاصل کرلیا۔ اگلے ہی سال 1758ء میں مرہٹوں نے لاہور پر قبضہ کرلیا اور پنجاب میں بھی اُن کی حکومت ہوگئی۔

ابدالی ہندوستان پر حملہ تو لوٹ مار کے لئے کرتا مگر ایک اچھا بہانہ اس لوٹ مار کا اُسے شاہ ولی اللہ کی دعوتِ یلغار سے بھی مل گیا۔ ہوا یوں کہ نادر شاہ کی لوٹ مار کے بعد مغلیہ فوج تقریباً بے کار ہوگئی۔ چنانچہ اب دِلّی کی مغلیہ حکومت دراصل مرہٹہ فوج کے بل بوتے پر چل رہی تھی اور مغل بادشاہ مرہٹوں کے وظیفے پر چل رہا تھا۔ اس بات پر دربار کے مسلمان علماء بڑا کڑھتے تھے۔ چنانچہ مرہٹوں کا اثرورسوخ ختم کروانے کے لئے شاہ ولی اللہ نے ابدالی کو ہندوستان پر ایک اور حملہ کرنے کی دعوت دے ڈالی۔ یہ حملہ ابدالی نے 1761ء میں کیا جس میں اُس نے پانی پت کی تیسری جنگ

میں مرہٹوں کو شکستِ فاش سے دوچار کیا۔

مرہٹوں کو شکست دینے کے بعد افغان فوجوں نے ہندوستان کی گرمی میں رہنے سے انکار کر دیا اور مجبوراً ابدالی کو واپس افغانستان کوچ کرنا پڑا۔ جاتے جاتے وہ پنجاب اور سندھ کو اپنی سلطنت میں شامل کر گیا جبکہ باقی سارا ہندوستان لُٹا پُٹا چھوڑ گیا۔

اب ہندوستان میں کوئی ایسی طاقت نہ بچی تھی جو انگریزوں کو روک سکتی۔ ایک ٹیپو سلطان تھا جس نے اُن کا بے جگری سے مقابلہ کیا مگر 1799ء میں اُس کو بھی شکست ہوئی جس کے بعد انگریز ہندوستان کے بے تاج بادشاہ بن گئے۔

مرہٹوں اور جاٹوں کو راستے سے ہٹانے کے بعد انگریز دِلّی کے اصل حکمران بن گئے۔ 1801ء سے مغل بادشاہ، جو پہلے مرہٹوں کے وظیفے پر جیتا تھا، اب کمپنی بہادر کے وظیفے پر گزر بسر کرنے لگا۔

☆☆.....☆☆

ساتواں باب

تحریکِ پاکستان

(1857ء سے 1947ء)

قیامِ پاکستان کے چند مناظر

قائدِ اعظم، علماء اور جارج ششم

علاّمہ شبیر احمد عثمانی قائدِ اعظم کے علمائے دین ساتھیوں میں سب سے نمایاں تھے۔ علاّمہ صاحب کے بقول قائدِ اعظم فاسق تھے اور مسلم لیگی لیڈروں کے گناہوں اور عیاشیوں کی وجہ سے بہت سے نیک مسلمان مسلم لیگ میں شامل ہونے سے ہچکچاتے تھے۔ علاّمہ صاحب کا کہنا تھا کہ مسلمانوں کو جناح صاحب کے لقب قائدِ اعظم سے خائف ہونے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں کیونکہ اس لقب کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ جناح صاحب مسلمانوں کے سب سے عظیم رہنما ہیں۔ علاّمہ صاحب کے مطابق لقب قائدِ اعظم کا مطلب محض یہ تھا کہ جناح صاحب سب سے اچھے سیاستدان ہیں۔ علاّمہ صاحب نے یہ بات واضح کی کہ جب مشہور پہلوان "زابسکو" ہندوستان آیا تھا تو مہاتما گاندھی یا جناح صاحب کو نہیں بلکہ رستمِ زماں گاماں پہلوان کو اس سے لڑنے

کے لئے بھیجا گیا تھا۔ اِسی طرح سیاسی و آئینی معاملات پر انگریز حکومت سے گفت و شنید کرنے کے لئے سب سے موزوں آدمی قائدِ اعظم ہی تھے۔ مگر اس کا یہ مطلب بالکل نہیں تھا کہ پاکستان بننے کے بعد بھی قائدِ اعظم یا سیاستدان اِس اسلامی ریاست کے رہنما ہوں گے۔ علّامہ صاحب کے مطابق ایسا بالکل نہ ہونا تھا بلکہ پاکستان کی ریاست کے معرضِ وجود میں آجانے کے بعد قائدِ اعظم سمیت سارے سیاستدانوں کا کام ختم ہو جانا تھا اور پاکستان کی مکمل باگ دوڑ علماء دین نے سنبھال لینی تھی۔ اِس ضمن میں علّامہ شبیر احمد عثمانی مثال دیا کرتے کہ جب ہندوستانی مسلمان حج پر جاتے ہیں تو بحری جہاز کا کپتان ایک انگریز ہوتا ہے۔ یہ انگریز کپتان حاجیوں سے بھرے جہاز کو جدّہ کے ساحل کے قریب تک پہنچا کر رُک جاتا ہے کیونکہ وہ عرب ساحل کو نہ جانتا ہے۔ اس جگہ سے ایک عربی کپتان آکر جہاز کی ناخدائی سنبھال لیتا ہے۔ اسی طرح، علّامہ صاحب فرماتے، ہندوستانی مسلمانوں کا سیاسی جہاز قائدِ اعظم کی کپتانی میں ہے، مگر پاکستان کی تخلیق کے ساتھ ہی یہ کپتانی قائدِ اعظم اور دوسرے سیاسی رہنماوں کے ہاتھ سے نکل کر علماء دین کے ہاتھوں میں آجائے گی جو شریعت کے معاملات بہتر سمجھتے ہیں۔

پاکستان کے قیام کے پہلے روز، آل انڈیا____ پاکستان مسلم لیگ کے صدر و بانیء پاکستان حضرت قائد اعظم محمد علی جناح نے اسلام کے نام پر قائم ہوئی نومولود سلطنتِ خداددِ پاکستان کے پہلے گورنر جنرل کے طور پر جو حلف اُٹھایا اُس کے چند الفاظ یہ تھے:

''میں، محمد علی جناح، حلف اُٹھاتا ہوں کہ گورنر جنرل پاکستان کی حیثیت سے آئینِ پاکستان کی پاسداری کروں گا اور شہنشاہ جارج

ششم کا وفادار رہوں گا۔"

صرف قائداعظم ہی نہیں، بلکہ اگلی دہائی میں بھی پاکستان کے تمام سربراہانِ مملکت بادشاہ یا ملکہ ءانگلستان کی وفاداری کی قسم کھانے کے بعد ہی پاکستان پر حکومت کرنے کی اجازت پاتے رہے۔

یومِ آزادی

مطالعہ پاکستان کی کتابوں کے مطابق پاکستان- 14 اگست 1947ء بروز جمعرات بمطابق-27 رمضان المبارک 1366ھ کو معرضِ وجود میں آیا۔

پچھلی کئی دہائیوں سے ہم- 14 اگست کو ہی سرکاری طور پر جشنِ آزادی مناتے آئے ہیں۔ مگر قائداعظم نے یہ شہنشاہ برطانیہ کی وفاداری والا گورنر جنرل پاکستان کا حلف- 14 اگست 1947ء کو نہیں اُٹھایا تھا۔ اُنہوں نے یہ حلف- 15 اگست 1947ء کو اُٹھایا تھا۔ اُنہوں نے گورنر جنرل کی حیثیت سے اپنی پہلی تقریر میں بھی فرمایا کہ-15 اگست ایک آزاد اور خودمختار پاکستان کی پیدائش کا دن ہے۔

آئینی اور قانونی طور پر پاکستان کا قیام جس قانون کے تحت عمل میں آیا وہ آزادیءہند کا قانون 1947ء یعنی Indian Independence Act, 1947 ہے جس میں آج بھی درج ہے کہ- 15 اگست 1947ء پاکستان کی پیدائش کا دن تھا۔ چونکہ پاکستان کو اپنے قیام کے ساتھ ہی بے شمار مشکلات کا سامنا کرنا پڑا لہٰذا تقریباً ایک سال تک پاکستان اپنی ڈاک ٹکٹ جاری نہ کر سکا۔ یہ آخرکار جولائی 1948ء میں جا کر ممکن ہو سکا جب پاکستان نے اپنی پہلی ڈاک ٹکٹ جاری کی، اور اس ڈاک ٹکٹ پر بھی ظہورِ پاکستان کی تاریخ- 15 اگست 1947ء ہی درج تھی۔ اس کے اگلے ہی ماہ پاکستان

کی پہلی سالگرہ کا دن تھا۔ مشکلات کی وجہ سے یہ سالگرہ عظیم الشان طریقے سے تو نہ منائی جا سکی مگر سرکاری طور پر بہر حال منائی گئی، اور پاکستان کی پہلی سالگرہ سرکاری طور پر- 15 اگست 1948ء کو منائی گئی۔ اس سالگرہ کے دو سال بعد یعنی 1950ء میں تعزیراتِ پاکستان (Pakistan Penal Code, 1860) میں ایک ترمیم کے ذریعے شِق 123 A-کا اضافہ کیا گیا۔ اس دفعہ کے مطابق پاکستان- 15 اگست 1947ء کو معرضِ وجود میں آیا اور قیامِ پاکستان کے خلاف پروپیگنڈا کرنے کی سزا دس سال قید رکھی گئی۔ قانون کی اس کتاب میں، جس کی دفعہ 302 کے تحت مجرموں کو پھانسی پر لٹکایا جاتا ہے، آج بھی قیامِ پاکستان کی تاریخ- 15 اگست 1947ء ہی درج ہے۔

پھر ہم یومِ آزادی کا جشن-14 اگست کو کیوں مناتے ہیں؟

ایسا ہی ایک سوال یومِ پاکستان کی تاریخ کا بھی ہے۔- 23 مارچ کو Pakistan Day منایا جاتا ہے۔ یہ 1940ء میں مسلم لیگ کے قراردادِ پاکستان (قراردادِ لاہور) منظور کرنے کی یاد میں منایا جاتا ہے ، جس میں مسلم لیگ نے قیامِ پاکستان کا اصولی مطالبہ کر دیا تھا۔ یہ قرارداد، جسے مسلم لیگ کے سابقہ صدر اور احمدی رہنما سر ظفر اللہ نے تحریر کیا تھا،- 23 مارچ کو پیش اور- 24 مارچ 1940ء کو منظور کی گئی۔ کیا اس قرارداد کی یاد- 23 مارچ کو منانی چاہیئے یا- 24 مارچ کو؟ اصولاً- 24 مارچ کو۔ گو یہاں پھر بھی کچھ گنجائش ہے کہ شاید کسی نے سوچا کہ قرارداد منظور ہونا اتنا اہم واقعہ نہیں تھا جتنا کہ اُس کا پیش کیا جانا، وغیرہ۔ اور ایسا سوچنے والا کوئی صاحبِ طاقت و اختیار ہو گا اور اُس نے فیصلہ سنا دیا ہو گا کہ یومِ پاکستان- 23 مارچ کو ہی منایا جائے، جس

کی سمجھ اور فیصلے پر ساری قوم آج تک سرِ تسلیم خم کر کے - 23 مارچ کو ہی چھٹی پاتی اور یاد مناتی ہے۔

نظریہ ءپاکستان اور نظریہ ءاسرائیل

1930ء کی دہائی میں جب مسلم لیگ نے تقسیمِ ہند اور قیامِ پاکستان کا مطالبہ پُرزور طور پر کرنا شروع کر دیا تو یہ بھی سوچا کہ اُمتِ مسلمہ کو بھی اس کارِ خیر میں شامل کیا جائے تا کہ تمام دنیا کے مسلمان غیر مسلموں سے مطالبہ کریں کہ سرزمینِ ہندوستان میں بسنے والے مسلمان اپنے علیحدہ دین کی وجہ سے علیحدہ قوم ہیں لہٰذا اُنہیں ہندوستان کا بٹوارہ کر کے ایک علیحدہ ملک پاکستان دیا جائے۔

چنانچہ جب 1938ء میں مصر کے شہر قاہرہ میں فلسطین کانفرنس منعقد ہوئی تو مسلم لیگ کی جانب سے چوہدری خلیق الزمان نے اس میں شرکت کی۔ وہاں چوہدری صاحب نے مختلف عرب مسلم لیڈروں سے قیامِ پاکستان کے حق میں بیان لینے کی کوشش کی مگر اُن سب نے صاف انکار کر دیا۔ اُن سب کا کہنا تھا کہ مسلم لیگ تو وہی بات کر رہی ہے جو یہودی کرتے ہیں۔ یعنی مذہب کی بنیاد پر قومیت اور اُسی کی بنیاد پر علیحدہ ملک۔ اُن کے مطابق قیامِ پاکستان کی حمایت کرنے کا صاف مطلب قیامِ اسرائیل کی حمایت کرنا تھا۔

اسرائیل، جسے ترکی نے 1950ء میں اور مصر نے 1979ء میں تسلیم کر لیا تھا، 1947ء میں پاکستان کی طرح انگریز کے زیرِ تسلط ایک علاقہ تھا۔ اُس زمانے میں ہندوستان میں مسلمان اور فلسطین میں یہودی انگریز سے مطالبہ کر رہے تھے کہ اپنے اپنے علاقے میں وہ مذہب کی بنیاد پر علیحدہ اقوام ہیں لہٰذا جب انگریز یہ علاقے چھوڑ کر

جائے تو اُنہیں اُن کے علیحدہ ممالک یعنی پاکستان اور اسرائیل دے کر جائے۔

ہندوستانی مسلمان کہتے تھے کہ وہ قریب بارہ صدیاں پہلے ہندوستان پر حملہ آور ہوئے اور کوئی سات سو سال یہاں کے مختلف علاقوں پر حکومت بھی کی۔ سو بمطابق

ہر مُلک ملکِ ماست

کہ ملکِ خدائے ماست

ہندوستان میں اُن کے رہائشی اور حکومتی علاقے اُن کی ملکیت ہو چکے ہیں جو اُن کو دے دیئے جائیں کیونکہ غیر مذہب اقوام کے ساتھ رہ کر اُن کا دھرم بھرشٹ ہو جانے کا خدشہ تھا۔

دوسری طرف یہودیوں کا کہنا تھا کہ اُن کے آباء یعنی حضرت ابراہیمؑ عراق میں رہتے تھے۔ آسمانی کتاب توریت کے مطابق خدا نے اُنہیں فلسطین میں لا کر بسایا اور یہ ملک قیامت تک کے لئے یہودیوں کو عطا کر دیا۔ لہٰذا پچھلے چار ہزار سال سے یہ ملک خدائی تحفہ کے طور پر اُن کے پاس ہے اور اُس پر لگ بھگ چھ سو سال اُن کے پیغمبروں نے، جن میں حضرت دائودؑ اور حضرت سلیمانؑ بھی شامل ہیں، حکومت کی۔ اُس کے بعد یہ علاقہ مختلف اقوام کے زیرِ حکومت آتا رہا مگر یہودی مسلسل یہاں بستے رہے۔ لہٰذا یہ ان کا ملک ہے اور اب جب کہ انگریز یہاں سے جا ہی رہے ہیں تو وہ اُن کا ملک اُن کے حوالے کر کے جائیں۔

مذہبی بنیادوں پر پاکستان کے قیام کے بعد یہودیوں نے مذہبی بنیادوں پر اسرائیل کے قیام کی تحریک پر اور زور دینا شروع کر دیا۔ یہ معاملہ اقوامِ متحدہ پہنچا تو

اسرائیل مخالف ممالک نے پاکستان کے مندوب سر ظفراللہ کو اپنا لیڈر چُنا مگر اُن کی ہر دلیل پر اُن کے سامنے قیامِ پاکستان ہی کی مثال رکھی گئی، اور یوں نظریہ ٔپاکستان کے فلسفے کی بنیاد پر 1948ء میں اسرائیل بھی معرضِ وجود میں آ ہی گیا۔

اقلیتی لیگ

دیوبندی علمائے ہند کی قیامِ پاکستان کی مخالفت کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ آل انڈیا مسلم لیگ میں اثرورسوخ رکھنے والے بہت سے رہنما شیعہ اور اسماعیلی تھے۔

آل انڈیا مسلم لیگ کے پہلے اور آخری صدور اسماعیلی تھے۔ پہلے سر آغا خان اور آخری حضرت قائداعظم۔ اور تو اور 1931ء میں احمدی رہنما سر ظفراللہ بھی آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر چُنے گئے۔ جناح صاحب پانچ بار مسلم لیگ کے صدر منتخب ہوئے۔ 1916ء میں، پھر 1924ء میں، اس کے بعد 1929ء میں، پھر 1934ء اور آخری بار 1937ء میں۔ پانچویں بار دس سال پر محیط تھی جب وہ 1937ء سے 1947ء تک مسلسل مسلم لیگ کے صدر رہے۔

ہر سیاسی پارٹی کی طرح آل انڈیا مسلم لیگ کو چلانے کے لئے بھی چندے کی ضرورت پڑتی تھی جو کہ امیر مسلمان ہی دے سکتے تھے۔ ہندوستانی مسلمانوں میں دو طبقے امیر تھے۔ جاگیردار اور کاروباری۔ چونکہ جاگیریں زیادہ تر انگریز سرکار کی مرہونِ منت تھیں لہٰذا جاگیردار عمومی طور پر انگریز مخالف سیاست سے گریز کرتے تھے۔ چنانچہ چندہ کاروباری مسلمانوں سے ہی آیا کرتا تھا۔ یہ طبقہ زیادہ تر تجارتی بندرگاہوں جیسے ممبئی، مدراس اور کلکتہ میں آباد تھا اور ان لوگوں میں بہت سے اسماعیلی، شیعہ اور

احمدی تھے۔ اسی وجہ سے مسلم لیگ کے بہت سے صدور بھی وہ چُنے گئے جن کا ان طبقوں پر اثر ورسوخ تھا اور وہ ان سے چندہ جمع کرنے میں معاون ہو سکتے تھے۔ چونکہ حکمران انگریز تھے اس لئے رہنمائی بھی اُنہی لوگوں کو سونپی جاتی جو انگریزی تعلیم بھی رکھتے تھے اور انگریزی نظام کو بھی خوب سمجھتے تھے۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ سلطنتِ خداداد پاکستان کو بنانے والی سیاسی جماعت آل انڈیا مسلم لیگ کے زیادہ تر صدور مذہبی رجحان کے دقیانوسی علماء دین نہیں بلکہ انگریزی تعلیم یافتہ اور القاب یافتہ بابو لوگ تھے۔ ان لوگوں میں سے چند معروف شخصیات کا مختصر تعارف درج ذیل ہے:

سر آغا خان

1906ء اور 1909ء میں مسلم لیگ کے صدر سر آغا خان تھے۔ سر سلطان محمد شاہ___ آغا خان III، اسماعیلیوں کے 48ویں امام جو 1877ء میں کراچی میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے انگلستان کے مشہور ایٹن (Eton) سکول اور کیمبرج یونیورسٹی سے تعلیم پائی۔ تاجِ برطانیہ سے سر کا خطاب پانے کے بعد 1932ء میں لیگ آف نیشنز میں ہندوستان کے مندوب مقرر ہوئے۔ 1934ء میں پریوی کونسل (Privy Council) کے ممبر بنے۔ 1937ء میں لیگ آف نیشنز کے صدر بنے۔ اُن کی عوامی خدمات پر شہنشاہِ جرمنی، ترک سلطان اور شاہِ ایران نے بھی انہیں خطابات سے نوازا۔

سر آدم جی پیر بھائی

1907ء میں مسلم لیگ کے صدر سر آدم جی پیر بھائی تھے۔ یہ جنگِ آزادی

سے گیارہ سال پہلے 1846ء میں ہندوستان کے صوبے گجرات میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق اسماعیلیوں کے ایک فرقے دائودی بوہرہ سے تھا۔ یہ اپنے وقت کے سب سے بڑے ہندوستانی کاروباری شخص شمار کئے جاتے تھے۔ ممبئی میں ان کے کاٹن اور چمڑے کے کارخانے تھے۔ 1900ء میں انہیں قیصرِ ہند کا خطاب دیا گیا۔ 1907ء میں انہیں تاجِ برطانیہ کی طرف سے سر کا خطاب ملا۔ گو کہ وہ اَن پڑھ تھے مگر محمدن ایجوکیشنل کانفرنس نے انہیں اپنا پہلا صدر منتخب کیا۔ انہوں نے بے شمار فلاحی کام سرانجام دیئے جن میں بہت سے قبرستان، سرائے، مساجد، ہسپتالوں اور سکولوں کی تعمیر شامل تھی۔ ان فلاحی کاموں کا دائرہ نہ صرف ہندوستان بلکہ مکہ، مدینہ، کربلا اور یمن تک پھیلا ہوا تھا۔

سر علی امام

1908ء میں مسلم لیگ کے صدر سر علی امام تھے۔ یہ کمپنی بہادر کے خلاف لڑی گئی جنگِ آزادی کے بارہ سال بعد 1869ء میں پٹنہ کے ایک شیعہ گھرانے میں پیدا ہوئے۔ انگلستان سے قانون کی تعلیم حاصل کی، تاجِ برطانیہ سے سر کا خطاب پایا۔ مسلم لیگ کی صدارت کرنے کے نو سال بعد انہیں انگریز سرکار کی طرف سے پٹنہ ہائی کورٹ کا جج مقرر کر دیا گیا۔ 1919ء میں یہ ریاست حیدر آباد کے وزیر اعلیٰ بھی مقرر ہوئے۔

نواب سلیم اللہ

1912ء میں مسلم لیگ کے صدر نواب سلیم اللہ تھے۔ یہ 1871ء میں بنگال کے ایک شیعہ گھرانے میں پیدا ہوئے۔ تقسیمِ بنگال اور مسلمانوں کی انگریزی تعلیم کے بڑے داعی تھے۔ یہ بنگال کی قانون ساز اسمبلی (Bengal Legislative Assembly) کے ممبر اور ڈھاکا یونیورسٹی کے بانیوں میں سے تھے۔ ان کے پوتے خواجہ ناظم الدین پاکستان کے وزیر اعظم بھی بنے۔

محمد علی جوہر

1918ء میں مسلم لیگ کے صدر مولانا محمد علی جوہر تھے۔ یہ 1878ء میں رام پور میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے دارالعلوم دیوبند، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور آکسفورڈ یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کر رکھی تھی۔ یہ تحریکِ خلافت کے ممتاز رہنمائوں میں سے تھے جس تحریک کی قیادت مہاتما گاندھی کر رہے تھے۔

حسرت موہانی

1921ء میں مسلم لیگ کے صدر مولانا حسرت موہانی تھے۔ یہ 1875ء میں اُترپردیش میں پیدا ہوئے اور علی گڑھ یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی۔ یہ کیمونسٹ پارٹی آف انڈیا کے بانی ممبروں میں شامل تھے۔

سر عبدالرحیم

1925ء میں مسلم لیگ کے صدر سر عبدالرحیم تھے۔ یہ 1867ء میں بنگال میں پیدا ہوئے۔ انگلستان سے قانون کی تعلیم حاصل کی اور 1908ء میں مدراس ہائی کورٹ کے جج مقرر ہوئے۔ پھر چیف جسٹس بنے اور سر کا خطاب پایا۔ بعد ازاں کلکتہ یونیورسٹی میں قانون کے ٹیگور پروفیسر مقرر ہوئے۔

سر عبدالقادر

1926ء میں مسلم لیگ کے صدر سر عبدالقادر تھے۔ انہوں نے انگلستان سے قانون کی تعلیم حاصل کر رکھی تھی۔ انہیں 1927ء میں تاجِ برطانیہ کی طرف سے سر کے خطاب سے نوازا گیا۔ ان کے صاحبزادے منظور قادر قیامِ پاکستان کے بعد لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس بھی رہے۔

ڈاکٹر محمد اقبال

1930ء میں مسلم لیگ کے صدر سر محمد اقبال تھے۔ یہ 1877ء میں سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے فلسفہ میں ڈاکٹریٹ بھی کر رکھی تھی اور انگلستان سے قانون کی تعلیم بھی حاصل کی تھی۔ 1922ء میں انہیں سرکارِ برطانیہ کی طرف سے سر کا خطاب عطا کیا گیا۔

سر ظفر اللہ

1931ء میں مسلم لیگ کے صدر سر ظفر اللہ تھے۔ یہ ایک معروف احمدی

رہنما تھے۔ یہ 1893ء میں سیالکوٹ میں پیدا ہوئے اور انگلستان سے قانون کی تعلیم حاصل کی۔ 1935ء میں ہندوستان کے وزیر ریلوے بنے اور 1941ء میں فیڈرل کورٹ آف انڈیا کے جج مقرر ہوئے۔ یونائیٹڈ نیشن کی جنرل اسمبلی کے صدر بنے اور انٹر نیشنل کورٹ آف جسٹس کے بھی صدر رہے۔

سر وزیر حسن

1936ء میں مسلم لیگ کے صدر سر وزیر حسن تھے جنہوں نے اپنے صدارتی خطاب میں ہندو مسلم ایکتا پر زور دیا تھا۔ یہ 1874ء میں اُتر پردیش میں پیدا ہوئے اور اودھ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس بھی رہے۔ ان کے صاحبزادے سجاد ظہیر تھے جنہوں نے فیض احمد فیض کے ساتھ مل کر پاکستان کیمونسٹ پارٹی کی بنیاد رکھی تھی۔

جناح

1916ء، 1924ء، 1929ء، 1934ء اور پھر 1937ء سے لے کر 1947ء تک مسلم لیگ کے صدر محمد علی جناح تھے۔ یہ ہمارے محبوب لیڈر اور بانیء پاکستان حضرت قائداعظمؒ تھے، جو گجراتی صوبے کے ایک اسماعیلی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ 1876ء میں کراچی میں پیدا ہوئے اور انگلستان سے قانون کی تعلیم حاصل کی۔

مسلم لیگ کی ایسی ہی مغربی تعلیم یافتہ اور ترقی پسند لیڈر شپ کی وجہ سے کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ کوئی مذہبی یا انقلابی خیالات رکھنے والے لوگوں کی

نمائندہ جماعت نہ تھی بلکہ ہندوستان کی مسلمان اشرافیہ کی نمائندہ انگریزی رجحانات سے لبریز ایک ترقی پسند جماعت تھی جس کی تاریخی دلچسپی انگریز سے آزادی حاصل کرنے سے زیادہ مسلم اشرافیہ کے لئے رعائتیں حاصل کرنے پر مرکوز تھی۔

سر آغا خان، خلافتِ عثمانیہ اور یہودی

دنیا میں اس وقت تین کروڑ کے قریب اسماعیلی مسلمان بستے ہیں۔ یہ شیعہ مسلمانوں کا 20 فی صد بنتے ہیں اور ان سب کے امام حاضر پرنس کریم آغا خان IV ہیں جو تحریکِ پاکستان کے مایہ ناز رہنما سر آغا خان کے پوتے ہیں۔

پہلی جنگِ عظیم سے پہلے بیت المقدس ترکی کی سلطنتِ عثمانیہ کا حصہ تھا۔ اُس وقت تک یہودی یہ جان چکے تھے کہ وہ چاہے دنیا کے کسی بھی ملک میں جا بسیں اور وہاں اُن کی چاہے کتنی ہی نسلیں پروان چڑھ جائیں، کوئی بھی ملک اُنہیں کبھی نہ اپنائے گا۔ جس حکومت کا جب جی چاہے گا وہ اُن کا مال و اسباب ضبط کر کے اُنہیں ملک بدر کر دے گی۔ اُن کا یہ ماننا اسرائیل کی سلطنت کی تباہی کے بعد دنیا بھر میں دربدر کی ٹھوکریں کھانے کی ڈھائی ہزار سالہ تاریخ پر مبنی تجربے کی بنیاد پر تھا۔

یہ سفر تیرھویں صدی قبل مسیح میں حضرت موسیٰؑ کی رہنمائی میں شروع ہوا جب وہ فرعونِ مصر کی غلامی سے آزاد ہو کر اپنے ملک اسرائیل کی طرف واپسی کے سفر پر گامزن ہوئے۔ چالیس سال تک صحرائے سینا میں بھٹکتے رہے جس کے دوران، عقیدے کے مطابق، اُن پر من و سلویٰ اُترتا رہا اور کوہِ طور پر حضرت موسیٰؑ خدا سے بھی ہم کلام ہوئے۔ آخر کار یہودی اسرائیل پہنچ گئے اور اُس پر قبضہ کر کے سلطنتِ

اسرائیل کی بنیاد رکھی۔

اسرائیل کا فلسطین (پرانا نام کنعان) کے علاقے میں قائم ہونے کا قصہ بھی دلچسپ ہے۔ بائبل، جسے کلامِ مقدس بھی کہا جاتا ہے، کے دو حصے ہیں: عہد نامہ ءقدیم اور عہد نامہ ءجدید۔ عہد نامہ ءجدید دراصل الہامی کتاب انجیل ہے جو حضرت عیسیٰؑ پر نازل ہوئی۔

عہد نامہ ءقدیم، جسے عہد نامہ ءعتیق بھی کہتے ہیں، یہودیوں کی مقدس کتاب ہے جس کی پہلی پانچ کتابیں الہامی کتاب توریت کی ہیں جبکہ باقی کتابیں الہامی کتاب زبور کی ہیں۔ یہ اُن انبیائے کرام پر نازل ہوئیں جنہیں یہودی مانتے ہیں، جیسے حضرت موسیٰؑ، حضرت داؤدؑ، وغیرہ۔

عہد نامہ ءقدیم کے مطابق حضرت ابراہیمؑ عراق کے شہر "اُر" کے باسی تھے۔ خدا نے اُنہیں وہاں سے فلسطین بلایا اور وعدہ لیا کہ وہ اور اُن کی آل خدا کی بندگی کریں گے جس کے بدلے میں خدا نے فلسطین کا علاقہ قیامت تک کے لئے حضرت ابراہیمؑ اور اُن کی آل یعنی یہودیوں کے بارہ قبائل کو بخش دیا۔

خدا اور حضرت ابراہیمؑ کے اس وعدے کی نشانی کے طور پر خدا نے حکم دیا کہ ہر یہودی کے ہاں لڑکے کی پیدائش پر اُس کا ختنہ کیا جائے۔ تاریخ دانوں کا اندازہ ہے کہ یہ قریب دو ہزار قبل مسیح کا زمانہ تھا جب عراق پر مشہور بادشاہ حمورابی کی حکومت تھی۔ یہ وہی بادشاہ تھا جس نے دنیا کی پہلی قانون کی کتاب لکھوائی تھی جس کا ایک قانون تھا "آنکھ کا بدلہ آنکھ۔"

لہٰذا یہودیوں کے مطابق فلسطین کے علاقے میں اسرائیل بنانے کی تین

وجوہات تھیں: پہلی یہ کہ یہ علاقہ خدا نے چار ہزار سال پہلے خاص طور پر یہودیوں کو تحفے کے طور پر تا قیامت عطا کیا تھا۔ دوسری یہ کہ چھٹی صدی قبل مسیح تک یہ یہودیوں کا ملک تھا جب عراقی بادشاہ نے اس پر قبضہ کر لیا، اور تیسری یہ کہ دنیا کا کوئی اور ملک اُن کو قبولنے کے لئے تیار نہیں تھا۔

1939ء میں دوسری جنگِ عظیم کی شروعات پر دنیا میں قریب ڈیڑھ کروڑ یہودی آباد تھے جن میں سے آدھے ہٹلر نے چھ سالہ جنگِ عظیم کے دوران مار دیئے۔ مگر اس سے پہلے بھی یورپ اور خاص طور پر روس میں یہودیوں پر بہت مظالم ڈھائے جاتے تھے۔ اس کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ نوبل انعام پانے کے اگلے سال 1922ء میں مشہور سائنس دان آئن سٹائن جرمنی سے سنگاپور گیا تاکہ یروشلم یعنی بیت المقدس میں عبرانی یونیورسٹی کے قیام کے لئے صاحبِ ثروت یہودیوں سے چندہ جمع کرے۔ وہاں اُس نے اپنی تقریر میں اعلان کیا کہ یہودیوں کے لئے یہ یونیورسٹی ناگزیر ہو چکی تھی کیونکہ دوسرے ملکوں کی یونیورسٹیاں یہودیوں کے بچوں کو داخلے دینے پر تیار نہ تھیں۔

تو ہم بات کر رہے تھے کہ پہلی جنگِ عظیم سے پہلے فلسطین سلطنتِ عثمانیہ کا حصہ تھا اور یہودی وہاں زیادہ سے زیادہ تعداد میں آباد ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ اسی سلسلے میں مشہور یہودی خاندان روتھس چائلڈ نے ایک وفد ترکی کے عثمانیہ خلیفہ کے پاس بھیجا جس کے ذریعے خلیفہ سے یہ درخواست کی گئی کہ وہ یہودیوں کو فلسطین میں آباد ہونے کی اجازت دے دے۔ یہودیوں نے وعدہ کیا کہ وہ نہ صرف خلیفہ کی طرف سے عائد کی جانے والی تمام شرائط پر کاربند رہیں گے بلکہ رہنے کی جگہ بھی وہ

وہاں کے رہائشیوں سے منہ مانگی قیمت پر اُن کی رضامندی سے حاصل کریں گے۔ گو کہ خلیفہ نے یہودیوں کی یہ درخواست مسترد کر دی لیکن مزے کی بات یہ تھی کہ یہودیوں کے اس وفد میں معروف مسلم لیگی لیڈر سر آغاخان بھی شامل تھے۔ اس کی وجہ نہ صرف یہ تھی کہ سر آغاخان کے تعلقات دنیا کے بڑے بڑے کاروباری یہودیوں سے تھے بلکہ یہ بھی کہ خلیفہ سر آغاخان کی بات کو بڑی اہمیت دیتا تھا کیونکہ اُس کی سلطنت میں لاکھوں کی تعداد میں اسماعیلی بستے تھے جن کے امام سر آغاخان تھے۔

ویسے تو یہ بھی ایک دلچسپ بات ہے کہ جب پہلی جنگِ عظیم کے اختتام پر مصطفیٰ کمال اتاترک نے خلافتِ عثمانیہ کا خاتمہ کیا تو جن دو ہندوستانی مسلمان لیڈروں نے اسے خط لکھا کہ وہ مسلمانوں کے بین الاقوامی اتحاد کی خاطر خلافت کو ختم نہ کرے وہ سیّد امیر علی اور سر آغاخان تھے۔ اتفاق سے یہ دونوں حضرات شیعہ مسلک سے تعلق رکھتے تھے اور سنّی خلافت عثمانیہ پر اعتقاد نہ رکھتے تھے۔

چندہ برائے علی گڑھ یونیورسٹی

1898ء میں جب سر سیّد احمد خان کی وفات ہوئی تو محمڈن اینگلو اورینٹل (ایم۔اے۔او) کالج ڈیڑھ لاکھ روپے کے خسارے میں تھا۔ اس کا یونیورسٹی بننا تو دور، اس کے روز کے خرچ بھی پورے ہونا محال تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے ہندوستان کے مسلمانوں کو جدید تعلیم کے اسلحے سے لیس کرنے کا خواب بھی سر سیّد کے ساتھ ہی دم توڑ جائے گا۔

مگر اس کڑے وقت میں جب اس مسلم کالج کی بنیادیں بھی لرزتی دکھائی

دیتی تھیں اسے سر آغا خان نے سہارا دیا۔ نہ صرف سر آغا خان نے اپنی جیب سے خطیر رقم چندے کے طور پر پیش کی بلکہ اپنے شیعہ، سنّی، اسماعیلی اور ہندو دوستوں اور کاروباری تعلق داروں سے بھی کثیر چندہ دلوا کر نہ صرف کالج کی تمام ضروریات پوری کر دیں بلکہ علی گڑھ یونیورسٹی کا قیام بھی ممکن بنایا۔

ویسے سر آغا خان ہندو یونیورسٹی بنارس کے بھی سب سے زیادہ چندہ دینے والے مخیر حضرات میں شامل تھے۔

اُس زمانے میں بھی ہندو اور مسلمانوں کا جھگڑا تو موجود تھا ہی مگر زیادہ جھگڑا شمالی اور جنوبی ہندوستانیوں کا تھا۔ سر سیّد احمد خان کا بھی کہنا تھا کہ شمالی اور جنوبی ہندوستان دراصل دو مختلف ممالک ہیں جن میں دو مختلف ثقافتوں کی حامل دو مختلف اقوام بستی ہیں۔ علی گڑھ یونیورسٹی کے انتظام میں بھی شمالی اور جنوبی ہندوستان کی ثقافتی تقسیم ایک مسئلہ تھی۔ علی گڑھ یونیورسٹی شمالی ہندوستان میں واقع تھی اور اُس سے سب سے زیادہ مستفید بھی شمالی ہندوستان کے مسلمان ہوتے تھے۔ لیکن چندہ تمام کا تمام جنوبی ہندوستان اور بنگال کے کاروباری اور پیشہ ور مسلمانوں کی طرف سے دان کیا جاتا تھا۔ اس کے باوجود یونیورسٹی کے بورڈ میں صرف شمالی ہندوستان کے لوگوں کو جگہ دی جاتی اور بنگال اور جنوبی ہندوستان سے کوئی مسلمان شامل نہ کیا جاتا۔

مسلم ذات پات اور یکجہتی

سب سے پہلے انگریزوں کے زیرِ حکومت آجانے کے باعث بنگال میں انگریزی زبان سیکھنے، انگریزی تعلیم حاصل کرنے اور انگریز سرکار کی نوکری کرنے کا رجحان سب سے زیادہ تھا۔ وہاں کا کاروباری طبقہ بھی بڑا امیر تھا، جس میں ہندو اور

مسلمان دونوں شامل تھے۔ شمالی ہندوستان کے ہندو اور مسلمان، بنگالی اور جنوبی ہندوستان کے ہندوئوں اور مسلمانوں کو کمتر جانتے اور ناپسند کرتے تھے۔

شمال جنوب اور مشرق مغرب کی یہ تقسیم اُسی وقت اور بھی کُھل کر سامنے آگئی جب ہندوستانیوں کے ہاتھ میں حکومت کی چند ڈوریاں تھمانے کے لئے 1882ء میں سیلف گورنمنٹ کے لئے ایک قدم اُٹھایا گیا۔ 1888ء میں میرٹھ میں تقریر کرتے ہوئے سیّد احمد خان نے کہا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک راجپوت یا پٹھان کسی بنگالی کے ماتحت ہو جائیں؟

اسی طرح 1885ء میں قائم ہونے والی انڈین نیشنل کانگرس کی مخالفت سر سیّد احمد خان اسی لئے کرتے رہے کہ اُس میں نمایاں کردار بنگالی لیڈروں کا تھا۔

1857ء کے بعد انگریز — مسلمان تعلقات

مغل دورِ حکومت میں ہندوستان کی سرکاری زبان فارسی تھی۔ پنجاب میں سکھوں کی حکومت کے دوران بھی سرکاری زبان فارسی ہی رہی۔ مگر جب 1849ء میں پنجاب پر انگریز کی حکمرانی ہو گئی تو سرکاری زبان فارسی سے بدل کے انگریزی کر دی گئی۔ جبکہ سکولوں سے پنجابی ختم کرکے اردو رائج کر دی گئی۔ اردو ویسے تو ہندی سے بہت مشابہت رکھتی تھی مگر اس کا رسم الخط عربی اور فارسی والا تھا، جبکہ ہندی دیوناگری رسم الخط میں لکھی جاتی تھی۔

1857ء میں کمپنی بہادر اور اُس کے دیسی سپاہیوں کی چپقلش ہوئی۔ معاملات خراب ہوتے گئے اور کئی چھائونیوں میں سپاہیوں نے عَلمِ بغاوت بلند کر دیا۔ صورتِ حال جلد ہی سیاسی صورت اختیار کر گئی اور چھوٹی بڑی کئی ہندوستانی سیاسی قوتوں

نے اسے خانہ جنگی میں تبدیل کر دیا۔ گو کہ آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر، جو ساٹھ سال کی عمر میں بادشاہ بننے کے بعد اب ایک اَسّی سالہ ضعیف شخص تھا، نہ تو اس سیاسی کشمکش کا حصہ بننا چاہتا تھا نہ ہی ایسا کرنے کی طاقت رکھتا تھا مگر ابھی تک وہ ہندوستان کی بادشاہت کا نشان تھا، اور کمپنی بہادر کے خلاف اس جنگِ آزادی میں مسلمان اور ہندوئوں کی یکساں شمولیت کے باعث کوئی اور ایسا لیڈر نہ اُبھرا تھا جس کے جھنڈے تلے سارے ہندوستانی اکٹھے ہو کر لڑتے۔ چنانچہ مسلمان نوابوں اور ہندو راجوں نے اپنی اپنی غریب عوام کو اکٹھا کر کے لڑانے اور اپنی اپنی جاگیروں پر قربان کرنے کے لئے مغلیہ سلطنت کے دفاع کا نعرہ لگایا۔ لہٰذا آخری مغل شہنشاہ کی مرضی کے خلاف اُس کے نام پر انگریز سے جنگ کا اعلان کر دیا گیا۔

یہ لڑائی جو زیادہ تر شمالی ہندوستان میں لڑی گئی تقریباً ایک سال چلی جس کے بعد مغل بادشاہ کو میانمار میں قید کر دیا گیا، بادشاہ کی نسل تہہ تیغ کر دی گئی اور ہندوستان کی حکومت ایسٹ انڈیا کمپنی نے تاجِ برطانیہ کے حوالے کر دی۔

اس لڑائی کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ وہ تمام امراء جنھوں نے مغل بادشاہ کا ساتھ دیا تھا اُن کی جائیدادیں بحق سرکارِ برطانیہ ضبط کر کے اُن سپاہیوں اور دوسرے لوگوں میں بانٹ دی گئیں جنھوں نے انگریزوں کا ساتھ دیا تھا۔

1857ء سے پہلے ہندوستانی مسلمان انگریزوں کو بدیسی تاجر اور غیر تہذیب یافتہ قوم سمجھتے تھے۔ مگر اب انگریز نہ صرف ہندوستان کا مستقل حصہ بن گئے بلکہ ہندوستان کی سب سے اعلیٰ اور تہذیب یافتہ قوم بھی مانے گئے۔

انگریز کی عالمی سلطنت کا حصہ ہونے کی وجہ سے انیسویں صدی کے اواخر

میں ہندوستان میں عالمی تجارت نے بہت فروغ پایا۔ اس کی وجہ سے مسلمان زمیندار غریب تر اور انگریز سرکار سے دور ہوتا گیا جبکہ ہندو تاجر طبقہ امیر اور انگریز سرکار کے قریب ہوتا گیا۔ اسی وجہ سے ہندو انگریزی تعلیم میں بھی مسلمانوں سے بہت آگے نکل گئے۔ نتیجتاً 1901ء میں ہندوستان میں انگریزی بولنے والے مسلمانوں کی تعداد تیرہ ہزار جبکہ ہندوئوں کی تعداد پچاس ہزار کے لگ بھگ تھی۔

1857ء کی جنگ اور 1906ء میں مسلم لیگ کے قیام کی درمیانی نصف صدی نے انگریزوں کی مسلم دشمن پالیسیوں کو مسلم دوست پالیسیوں میں بدلتے دیکھا۔ اس کی شروعات تو 1857ء سے ہی ہوئی جب مغل بادشاہ کے مسلمان ہونے اور بہت سے مسلمان نوابوں اور سرداروں کے جنگ میں حصہ لینے کی وجہ سے انگریزوں نے اسے ایک مسلم انگریز جنگ کے طور پر دیکھا اور فتح کے بعد بہت سی مسلم دشمن پالیسیاں رائج کیں۔ مگر 1871ء میں جب وائسرائے نے بنگال کے ایک انگریز افسر ڈبلیو۔ڈبلیو ہنٹر سے پوچھا کہ کیا مسلمان اپنے مذہب کی وجہ سے انگریزوں کے دشمن رہنے پر مجبور ہیں؟ تو ہنٹر نے جواب دیا کہ ایسا بالکل نہیں ہے۔ بلکہ اگر مسلمانوں کو عزت دی جائے تو وہ انگریزوں کے وفادار ثابت ہوں گے۔ مزید برآں اپنے بنگال کے تجربے کی بنیاد پر ہنٹر نے کہا کہ انگریزوں کی پالیسیوں کی وجہ سے ہندوئوں کو فائدہ اور مسلمانوں کو نقصان ہو رہا ہے اور وہ پہلے سے بھی غریب ہوتے جا رہے ہیں لہٰذا ضروری ہے کہ مسلمانوں کو خاص رعائتیں دی جائیں۔ یہ بات انگریز سرکار نے پلّے سے باندھ لی اور مسلمانوں کو ہندوئوں سے علیحدہ برتائو ملنے کی پالیسی کی داغ بیل پڑ گئی۔

بیسویں صدی کی اُمتِ مسلمہ

1917ء میں جب زارِ روس کا تختہ اُلٹ کر سُرخوں نے سوشلسٹ حکومت بنالی تو دوسری وسطی ایشیائی ریاستوں کی طرح بخارہ نے بھی روس سے آزادی کا اعلان کر دیا۔ یہ باغیانہ رویہ سُرخوں کی برداشت سے باہر تھا۔ لہٰذا اوِلادی میر لینن نے ٹینکوں سے حملہ کر کے بخارہ کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ اسی حملے میں بخارہ کا عظیم الشان مسلم کتب خانہ بھی نیست و نابود ہو گیا۔

اگلے سال 1918ء میں پہلی جنگِ عظیم کے اختتام پر مالِ غنیمت اور زخموں کے حساب میں معلوم ہوا کہ سلطنتِ عثمانیہ جنگ ہار چکی ہے۔ فاتح قوموں نے سلطنت توڑنے کی باتیں شروع کیں تو 1919ء میں ہندوستانی مسلمانوں نے ترکی کی خلافتِ عثمانیہ کو بچانے کے لئے تحریکِ خلافت چلائی جس میں شامل بڑے بڑے مسلمان سیاستدانوں اور علمائے کرام نے متفقہ طور پر تحریکِ خلافت کا رہنمائے اُتم مہاتما گاندھی کو چُنا۔

ترکی میں مسلم سلطنت تو 1453ء میں مضبوط ہوئی جب قسطنطنیہ (استنبول) ترک مسلمانوں نے فتح کر لیا۔ مگر سلطنتِ عثمانیہ خلافتِ عثمانیہ میں 1517ء میں تبدیل ہوئی جب مکہ و مدینہ ترکوں کے زیرِ حکومت آ گئے۔

بہر حال 1920ء میں خلافتِ عثمانیہ ختم ہو گئی۔ یہ وہ سال تھا جب فتح مکہ کے بعد تاریخ میں پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ مکہ معظمہ، مدینہ منورہ اور بیت المقدس کے تینوں مقدس مقامات غیر مسلموں کے زیرِ حکومت تھے۔ اُس وقت روئے زمین پر کوئی بھی آزاد اور خود مختار مسلم ریاست موجود نہ تھی۔

اسلامی ریاست کے دو نظریات

تحریکِ پاکستان کے دوران ہندوستان کے مسلمانوں میں دو طرح کے نظریات مقبول تھے۔ ایک وہ نظریہ تھا جس کے مطابق ہندوئوں کے ہندوستان میں مسلمانوں کا ایمان سخت خطرے میں تھا اور اس کی حفاظت کے لئے پاکستان کا قیام ناگزیر تھا۔ اس نظریئے کی بنیاد اُس فلسفے پر تھی جس کے داعی شاہ ولی اللہ (متوفی 1762ء) جیسے عالم تھے جن کا کہنا تھا کہ ہندوئوں کے بیچ میں رہ کر صرف وہی مسلمان اپنا دھرم بھرشٹ ہونے سے بچاسکتے ہیں جو شاہ صاحب کی طرح خالص عربی النسل ہوں۔ جو لوگ ہندوئوں سے مسلمان ہوئے ہیں اُن کے بارے میں بہت خطرہ تھا کہ وہ ہندوئوں کی عادات اور عقائد اپنا کر گمراہ ہو جائیں گے اور ہندوستان میں زیادہ تر ایسے ہی غیر عربی النسل مسلمان تھے۔ لہٰذا شاہ ولی اللہ نے فتویٰ دیا کہ ہندوستانی مسلمانوں کو ہندوئوں کے گھروں سے اتنے دُور گھر بنانے چاہیں کہ اُنہیں ہندوئوں کے باورچی خانوں کی چمنیوں کا دھواں بھی نظر نہ آسکے۔

جبکہ دوسرے نظریئے کے داعی کانگرس کے پریذیڈنٹ مولانا ابوالکلام آزاد جیسے لوگ تھے جو بار بار یہ سوال اُٹھاتے تھے کہ کیا اسلام اتنا ہی کمزور تھا ___ یا ہو چکا تھا ___ کہ جس ملک میں مسلمان اکثریت میں نہ ہوں گے وہاں اسلام صفحہء ہستی سے مٹ جائے گا؟ اپریل 1946ء میں مفسرِ قرآن مولانا ابوالکلام آزاد نے شورش کاشمیری کو رسالہ چٹان کے لئے انٹرویو دیتے ہوئے دو ٹوک کہا کہ اسلام انسان کی روحانی پاکیزگی کا دین ہے، اس کے نام پر زمینیں بانٹنا یا ملکوں کا بٹوارہ کرنا کسی بھی طرح جائز نہیں۔

تحریکِ پاکستان اور اقلیتیں

ریاست حیدر آباد دکن 1725ء میں مغلیہ حکومت سے علیحدہ ہوئی اور 1948ء تک ایک آزاد اور خود مختار ریاست کے طور پر قائم رہی۔

ساتواں اور آخری نظام حیدر آباد میر عثمان اتنا کنجوس تھا کہ مہمانوں کے جانے کے بعد ایش ٹرے سے سگریٹوں کے بچے ہوئے ٹکڑے پیا کرتا تھا اور جب وائسرائے بھی اُس سے ملنے آیا تو اُس نے نوکروں کو حکم دیا کہ اُسے شراب پیش نہ کی جائے کیونکہ اُس کی خرید پر بہت رقم خرچ ہوئی تھی۔ وہ کھانا ایک تانبے کی پلیٹ میں کھاتا تھا۔ ویسے پیپر ویٹ کے طور پر وہ ہیرے استعمال کیا کرتا تھا۔

حیدر آباد دکن کی ریاست کی آبادی سوا دو کروڑ تھی جبکہ ان میں سے مسلمان محض تیس لاکھ تھے۔ مگر حکومت مسلمانوں کے پاس ہونے کی وجہ سے کبھی اسلام کو خطرہ در پیش نہ آیا تھا۔ اس کے برعکس شیعہ مسلمانوں کو سنّی پاکستان سے عظیم خطرات لاحق تھے۔ چنانچہ 25 دسمبر 1945ء کو ہونے والی آل پارٹیز شیعہ کانفرنس نے قیامِ پاکستان کی مخالفت کر دی___ مگر کچھ ہی عرصے بعد اس یقین دہانی پر کہ پاکستان ایک ایسی مسلم ریاست ہو گی جس میں ہر مسلک برابر ہو گا، ہندوستان کے شیعوں نے پاکستان کی حمایت کا اعلان کر دیا۔ اسی طرح ہندوستان کے احمدیوں نے بھی قیامِ پاکستان کی مخالفت کی۔ مگر جب قائداعظم نے اُن کے لیڈر سر ظفر اللہ کو یقین دلایا کہ پاکستان ایک غیر مذہبی ریاست ہو گی جس میں احمدیوں اور سنّی یا شیعہ مسلمانوں میں کسی قسم کی کوئی تفریق نہ ہو گی، تو احمدیوں نے پاکستان کی حمایت کر دی، زور و شور سے تحریکِ پاکستان میں حصہ لیا اور قیامِ پاکستان کے لئے بڑی بڑی قربانیاں دیں۔ پنجاب باؤنڈری

کمیشن کے سامنے مسلم لیگ کا کیس احمدی مسلم لیگی لیڈر سر ظفر اللہ نے پیش کیا تھا اور سب مانتے ہیں کہ کمال پیش کیا تھا۔ یہ بھی ایک مزے کی بات ہے کہ ضلع گورداسپور میں مسلمانوں کی 51٪ آبادی اسی وجہ سے بنتی تھی کہ مسلم لیگ کے ایماء پر احمدیوں کو سرکاری اعداد و شمار میں مسلمان گنا گیا تھا۔

یہ بھی ایک بڑی دلچسپ بات ہے کہ اسلام کے نام پر قائم کیا گیا پاکستان جس کا اولین مقصد شریعتِ محمدیؐ کا فوری اطلاق تھا، اُسی سلطنتِ خداداد پاکستان کی پہلی مسلم لیگی حکومت نے پاکستان کا پہلا وزیرِ قانون بنگال کے ایک شودر ذات ہندو شری جے۔ این۔ منڈل کو چُنا تھا۔

46-1945ء میں کانگرس اور مسلم لیگ کے حالات

1946ء کے انتخابات میں کانگرس بڑے خسارے میں تھی کیونکہ اس نے دوسری جنگِ عظیم کے شروع ہونے پر ہندوستان چھوڑ دو تحریک شروع کر دی تھی تاکہ انگریزوں کو جنگ کے دوران تنگ کر کے ہندوستان چھوڑ دینے پر مجبور کیا جائے۔ اس تحریک کے نتیجے میں کانگرس کے تمام لیڈر 1942ء سے 1945ء تک جیلوں میں بند رہے تھے۔ لہٰذا دسمبر 1945ء اور جنوری 1946ء میں ہونے والے الیکشن کے لئے کانگرس اتنی بھرپور تیاری نہ کر سکی جیسی کہ اس دوران مسلم لیگ نے کی کیونکہ اس کے ہندوستان چھوڑ دو تحریک میں حصہ نہ لینے کی وجہ سے کوئی مسلم لیگی لیڈر گرفتار نہ کیا گیا تھا۔

دوسری طرف مسلم لیگ کے جذبہء تقسیمِ ہند کا یہ عالم تھا کہ اُس نے کیبنٹ مشن پلان منظور کر لیا تھا۔ یہ پلان - 16 مئی 1946ء کو انگلستان کے تین وزیروں پر

مشتمل کیبنٹ مشن نے دیا تھا۔ پلان یہ تھا کہ ہندوستان کو قطعی طور پر تقسیم کرنے کے بجائے جزوی طور پر تقسیم کر دیا جائے۔ وہ اس طرح کہ ہندوستان کو تین خود مختار صوبوں میں بانٹ دیا جائے۔ وہ ایسے کہ دفاع، خارجہ اور معیشت کے محکمے مرکزی حکومت کے پاس رہنے دیئے جائیں جبکہ باقی ہر چیز میں صوبے آزاد کر دیئے جائیں۔ ہندوستان کو تین صوبوں میں تقسیم کیا جانا تھا۔ پنجاب، سرحد اور سندھ پر مشتمل مسلم صوبہ، بنگال اور آسام پر مشتمل مسلم صوبہ اور باقی سارے ہندوستان پر مشتمل ہندو صوبہ۔ مسلم لیگ کی منظوری کے باوجود کانگرس نے یہ پلان مسترد کر دیا جس کی وجہ سے اس پر عمل نہ ہو سکا۔

پنجاب

1757ء میں پلاسی کی جنگ جیتنے اور بنگال میں ہندوستان کی پہلی انگریز حکومت قائم کرنے کے تقریباً نوّے سال بعد 1849ء میں سکھ فوج کو شکست دے کر انگریز نے پنجاب پر بھی اپنی حکومت قائم کر لی۔ فتحِ پنجاب کے آٹھ سال بعد 1857ء کی جنگِ آزادی لڑی گئی جس میں پنجاب کی بٹالین نے انگریز حکومت کا بھرپور ساتھ دیا، اور لگ بھگ پچاس سال بعد انگریز سرکار نے پشاور، کوہاٹ، بنوں، ہزارہ اور ڈیرہ اسماعیل خان کے اضلاع پنجاب سے علیحدہ کر کے صوبہء سرحد تشکیل دے دیا۔

اس کے بعد جب 1911ء میں انگریز حکومت اپنا دارالحکومت کلکتہ سے تبدیل کر کے دِلّی لے آئی تو دِلّی کو بھی پنجاب سے علیحدہ کر دیا گیا۔ اس تبدیلی کا اعلان بادشاہ جارج پنجم نے دِلّی دربار کے دوران دسمبر 1911ء میں کیا۔ یہ دربار انگریز بادشاہ کا جشنِ تاجپوشی تھا جس کی آن بان اور شان اکبر الٰہ آبادی نے اپنی نظم جلوہ دربار دہلی

میں کچھ اس طرح بیان کی ہے کہ:

سر مئی شوق کا سودا دیکھا
دہلی کو ہم نے بھی جا دیکھا
جو کچھ دیکھا اچھا دیکھا
کیا بتلائیں کیا کیا دیکھا

اوج بخت ملاقی اُن کا
چرخ ہفت طبقاتی اُن کا
محفل اُن کی ساقی اُن کا
آنکھیں میری باقی اُن کا

جشن عظیم اِس سال ہوا ہے
شاہی فورٹ میں بال ہوا ہے
روشن ہر اِک ہال ہوا ہے
قصہء ماضی حال ہوا ہے

پنجاب میں پنجابی قومیت کی بنیاد پر یونینسٹ پارٹی 1923ء میں قائم ہوئی اور 1946ء تک پنجاب کی سب سے کامیاب سیاسی پارٹی رہی۔ 1946ء کے انتخابات میں پنجاب کی صرف گیارہ فی صد آبادی ووٹ دینے کا حق رکھتی تھی۔ ان انتخابات میں ہندو، سکھ اور مسلمان نے علیحدہ علیحدہ ووٹ کرنے تھے کیونکہ مسلمانوں اور سکھوں نے اپنی مخصوص علیحدہ نشستوں پر ووٹ دینے تھے جبکہ ہندوئوں نے جنرل سیٹوں پر ووٹ دینے تھے۔

1946ء تک پنجاب کے تقسیم ہونے کی بات سرکاری طور پر کہیں نہ ہوئی تھی۔ لہٰذا یہ بات کسی بھی پارٹی کے منشور میں نہ تھی۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ پنجابیوں نے 1946ء میں پنجاب کی تقسیم کے حق میں یا خلاف ووٹ نہ دیئے تھے اور کوئی نہیں جانتا کہ اگر یہ بات منشور میں شامل ہوتی تو پنجابی کس جانب ووٹ ڈالتے۔

1946ء کے انتخابات میں مسلم لیگ نے مولوی اور پیر فقیر حضرات کی خاطر خواہ خدمات حاصل کیں۔ مسلم لیگ کی الیکشن مہم کے تین ستون یہ تھے:

1- اسلام خطرے میں ہے۔

2- مسلم لیگ کے مخالف دین سے خارج ہیں۔

3- مسلم لیگ کے حق میں ڈالا گیا ووٹ دراصل رسول اللہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حق میں ووٹ ہے۔

یہ نعرے اور بیانات سُن کر ہندوئوں اور سکھوں نے سمجھ لیا کہ مسلم لیگ جو پاکستان بنانے جارہی ہے اُس میں اُن کی حیثیت شودروں سے بھی بدتر ہونے والی ہے اور وہ پاکستان کے مزید سختی سے مخالف ہو گئے۔

جنوری 1946ء کے انتخابات میں پنجاب میں مسلم لیگ سب سے زیادہ نشستیں حاصل کرنے والی جماعت بن کر اُبھری۔ لیکن مسلم لیگ اسمبلی میں اکثریت حاصل نہ کر سکی تھی۔ لہٰذا مسلم لیگ حکومت نہ بنا سکی۔ حکومت سر خضر حیات ٹوانہ کی یونینسٹ پارٹی نے کانگرس اور سکھوں سے اتحاد کر کے بنالی۔

اِس حکومت کے خلاف مسلم لیگ نے عوامی احتجاج شروع کر دیا۔ حالات اتنے بگڑ گئے کہ مارچ 1947ء میں خضر حیات مستعفی ہو گئے اور حکومت ٹوٹ گئی۔ لیگی

احتجاج جو خضر حیات کے مستعفی ہونے سے پہلے نعرے لگاتا تھا ''خضر کنجر ہائے ہائے'' اور ''خضر ڈلا ہائے ہائے''، اُس نے استعفیٰ کے بعد نعرہ لگایا ''تازہ خبر آئی ہے خضر ہمارا بھائی ہے۔''

1946ء کے انتخابات میں پنجاب کے تمام کامیاب ہونے والے مسلمان زمیندار، جو یونینسٹ اور کانگرس پارٹیوں کی ٹکٹ پر جیتے تھے کانگرس کے اس اعلان پر کہ وہ آزاد ہندوستان میں زمینداری نظام ختم کر کے بڑی جاگیریں غریب کسانوں میں بانٹ دیں گے، سب مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ تاکہ اسلامی پاکستان میں اُن کی بڑی بڑی جاگیریں اُن سے کوئی چھین نہ سکے۔

خضر حیات کی حکومت گرنے کے بعد پنجاب کے انگریز گورنر نے مسلم لیگی رہنما نواب افتخار ممدوٹ کو حکومت بنانے کی دعوت دی مگر کانگرس اور سکھوں نے لیگ کے ساتھ اتحاد کرنے کے بجائے عوامی احتجاج شروع کر دیا۔ اس احتجاج کے دوران راولپنڈی میں مسلمانوں کے گروہوں نے مقامی سکھوں پر حملے شروع کر دیئے اور لوٹ مار اور قتل وغارت کا بازار لگا دیا۔ یہاں سے سکھ ___ مسلم بلوئوں کی وہ خونیں داستان شروع ہوئی جو کئی ماہ تک جاری رہی اور جس کے سامنے کلکتہ اور بہار کی خونریزی کے واقعات معصوم کہانیاں دکھائی دینے لگے۔

برٹش انڈین آرمی میں متحدہ پنجاب کے فوجیوں کی بہت بڑی تعداد شامل تھی۔ ان میں مسلمان، ہندو اور سکھ سب شامل تھے۔ دوسری جنگِ عظیم کے خاتمے پر 1945ء میں تقریباً دس لاکھ پنجابی فوجی نوکری سے فارغ کر کے گھروں کو بھیج دیئے گئے۔ چنانچہ 1947ء میں پنجاب میں کم از کم دس لاکھ لوگ ایسے تھے جنہیں نہ صرف

فوجی ٹریننگ حاصل تھی بلکہ اُن میں سے بہت سوں کے پاس اسلحہ بھی تھا اور یہ سب لڑاکا لوگ بے روزگار بھی تھے۔

ایک عجیب و غریب بات یہ ہوئی کہ پاکستان قیام پذیر ہوا- 15 اگست 1947ء کو مگر اُس دن ریڈ کلف ایوارڈ کا اعلان نہ ہوا۔ لہٰذا پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے پر پنجاب کے لوگوں کو معلوم نہ ہوا کہ پنجاب کے کون کون سے علاقے پاکستان میں شامل ہوئے ہیں اور کون کون سے ہندوستان میں۔ قیامِ پاکستان کے اعلان میں صرف یہی کہا گیا کہ آدھا پنجاب اس میں شامل ہے۔ اگلے دن یعنی- 16 اگست 1947ء کو بھی کوئی اعلان نہ ہوا کہ پنجاب کو کس طرح ہندوستان اور پاکستان میں بانٹا گیا ہے۔ اُس سے اگلے روز، یعنی- 17 اگست 1947ء کو لوگوں کو پتہ چلا کہ پنجاب کے کون کون سے علاقے پاکستان بن چکے تھے اور کون کون سے ہندوستان میں تبدیل ہو چکے تھے۔

جب- 17 اگست 1947ء کو ریڈ کلف ایوارڈ کا اعلان کیا گیا اور بتایا گیا کہ کونسے علاقے کس ملک میں شامل کئے گئے ہیں تو بے شمار لوگوں کو اچانک پتہ چلا کہ اُن کے گھر بار توراتوں رات دشمن ملک میں جا چکے ہیں اور جس پولیس اور انتظامیہ کو وہ اپنے جان و مال کی محافظ سمجھ رہے تھے وہ تو اُن لوگوں کی محافظ بن چکی تھی جو بلوئوں میں اُن کے گھر بار لوٹ رہے تھے، اُن کی خواتین کو اغواء کر رہے تھے، اور اُن کو قتل کر رہے تھے۔ یہ قاتل، جو صدیوں سے اُن کے اچھے ہمسایوں کی طرح اُن کے محلوں میں رہ رہے تھے، نجانے کیوں راتوں رات خونخوار بھیڑیوں میں تبدیل ہو چکے تھے۔ جانے کیسے پچھلے چند ماہ ماضی کی تمام صدیاں ہڑپ کر چکے تھے۔ یہ حال سرحد کے

دونوں طرف ایک ساتھا۔

پنجاب کی تقسیم سے تقریباً ایک کروڑ لوگ بے گھر ہوئے ، دس لاکھ لوگ مارے گئے، جبکہ ایک لاکھ خواتین اغواء ہوئیں، اور یہ سب کچھ ہوا بلا تفریقِ دین، مگر دین کے نام پر۔

بوٹا سنگھ اور زینب

پنجاب کے بٹوارے کے بعد دونوں طرف غدر مچ گیا۔ لوٹ مار، قتل و غارت اور عورتوں کا اغواء کئی ہفتوں تک معمول بنا رہا۔ اس درندگی میں عام آدمی کم جبکہ جرائم پیشہ لوگ زیادہ پیش پیش تھے۔

اس عالمِ حشر میں کچھ ایسے واقعات بھی ہوئے جس نے دونوں طرف کے لوگوں کے دل دہلا دیئے۔

بٹوارے کے کچھ ہی عرصے بعد ہندوستان اور پاکستان کی حکومتوں نے فیصلہ کیا کہ اغواشدہ خواتین بازیاب کروا کر اُن کو اُن کے خاندانوں کے حوالے کیا جائے۔ اس ضمن میں ایک مشہور واقعہ بوٹا سنگھ اور زینب کا ہے۔

زینب کو ہندوئوں یا سکھوں نے بٹوارے کے بلوئوں کے دوران اغواء کر لیا تھا۔ بوٹا سنگھ نے اُسے خرید کر اُس سے شادی کر لی اور اُن کے دو بچے ہو گئے۔ جب پاکستانی اور ہندوستانی حکومتوں نے دونوں طرف کی اغواء شدہ خواتین اُن کے خاندانوں کو واپس کرنا شروع کیں تو زینب کو بھی پکڑ کر پاکستان بھیج دیا گیا جہاں اُس کا خاندان فیصل آباد میں آباد ہو چکا تھا۔ زینب اپنی شیر خوار بچی پاکستان لے آئی اور بڑی بچی بوٹا سنگھ کے پاس ہی رہ گئی۔

اپنی بیوی کو واپس پانے کے لئے بوٹا سنگھ نے زینب کا پتہ ڈھونڈا، اسلام قبول کر کے جمیل احمد بن گیا اور اپنی بچی لے کر فیصل آباد آ گیا۔ یہاں پاکستانی پولیس نے اُسے بڑا ہراساں کیا مگر کسی نہ کسی طرح اُس نے مجسٹریٹ کی عدالت سے زینب کی بازیابی کا حکم حاصل کر ہی لیا۔ لیکن اُس وقت تک زینب کی شادی ایک مسلمان گھرانے میں کروائی جا چکی تھی۔ زینب نے عدالت میں آ کر بوٹا سنگھ عرف جمیل احمد کو پہچاننے سے انکار کر دیا۔ بوٹا سنگھ نے دلبرداشتہ ہو کر ریل کی پٹڑی پر سر رکھ کر خود کشی کر لی۔ ہر دل پگھل گیا۔ پاکستان کے مسلمانوں نے بوٹا سنگھ کو شریعت کے مطابق دفنایا اور اُس کے جنازے میں ہزاروں پاکستانی مسلمانوں نے شرکت کی۔

پاکستان کا مطلب اور پاکستان کا خواب

تحریکِ پاکستان کے دوران سیالکوٹ کے شاعر اصغر سودائی کا نعرہ بے حد مقبول ہوا۔ یہ نعرہ تھا ”پاکستان کا نعرہ کیا، لا الٰہ الا اللہ۔“

1970ء کی دہائی میں یہ نعرہ تبدیل کر کے ”پاکستان کا مطلب کیا، لا الٰہ الا اللہ“ بنا دیا گیا، جس کا مقصد کچھ لوگوں کے مطابق 1971ء میں مشرقی پاکستان کی بنگلہ دیش میں تبدیلی کی خفت پر جذبہء ایمانی کا پردہ ڈالنا تھا۔

پاکستان کے اکثر سرکاری دفاتر میں علامہ اقبال کی وہ تصویر آویزاں کی جاتی ہے جس میں اُنہیں کسی گہری سوچ میں غرق دکھایا گیا ہے۔ مقصد ہمیں باور کروانا ہے کہ 1930ء کے خطبہء الٰہ آباد میں اقبال نے پاکستان کا جو تصور پیش کیا تھا وہ اللہ تعالیٰ نے اُنہیں خواب کے ذریعے سُجھایا تھا۔

حال ہی میں یہ بات سامنے آئی ہے کہ برطانیہ کی آکسفورڈ یونیورسٹی کی

بودلین لائبریری میں تاریخ دان ایڈورڈ تھامپسن کے خطوط محفوظ ہیں۔ ان میں سے ایک خط انہیں 4- مارچ 1933ء کو لکھا گیا تھا۔ خط لکھنے والے شاعرِ مشرق علامہ اقبال تھے اور اس میں انہوں نے وضاحت کی ہے کہ 1930ء کے خطبہ الٰہ آباد میں انہوں نے قطعاً ایک علیحدہ مسلم ملک کا تصور پیش نہیں کیا تھا بلکہ اُس خطبے میں علامہ اقبال نے متحدہ ہندوستان میں شامل ایک مسلم صوبے کا تصور پیش کیا تھا۔

☆☆......☆☆

کتابیات

1. Rivers in World History, The Indus River, Shane Mountjoy, Chelsea House Publishers, 2005.
2. The Ancient Indus Valley, New Perspectives, Jane R. McIntosh, ABC-CL10, 2008.
3. Gem in the Lotus, The Seeding of Indian Civilization, Abraham Eraly, Penguin Books, 2000, 2015.
4. The Penguin History of Early India, From the Origins to AD 1300, Romila Thapar, Penguin Books, 2003.
5. A Study of History, Arnold J. Toynbee, abridgement by D.C. Somervell, Oxford University Press, 1946, reprinted by Laurel, Dell Publishing Co., Inc., 1978.
6. A New History of India, Stanely Wolpert, Oxford University Press, 1977, 2000.

7- تہذیب کی کہانی از ڈاکٹر مبارک علی، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، 2009۔

8. Five Thousand Years of Pakistan, An Archaeological Outline, R.E.M. Wheeler, Royal Book Company (1950), 1992.
9. The Indus Saga and the Making of Pakistan, Aitzaz Ahsan, Nehr Ghar Publications, 2001.
10. The Story of Civilization, Part I, Our Oriental Heritage, Will Durant, Simon and Schuster, NY, 1954.
11. The Oxford University of India, From the Earliest Times to the end

of 1911, Vincent A. Smith, Oxford, 1919.

12. History of Pakistan, Pakistan Through Ages, Prof. Dr. Ahmad Hasan Dani, Sang-e-Meel Publications, 2008.
13. Oxford History of India, Late Vincent A. Smith, edited by Percival Spear, Oxford University Press, Karachi, 4th Edition, 1983, 3rd Impression, 1988.
14. A Comprehensive History of Ancient India, P.N. Chopra (ed.), Sterling Publishers Private Limited, 2003.
15. The Wonder that was India, A.L.Basham, Rupa & Co, 1994.
16. The Story of the Jews, Finding the Words, 1000BC- 1492AD, Simon Schama, CCCO, An Imprint of Harper Collins Publishers, 2013.
17. Holy Bible, The New King James Version, American Bible Society, New York, 1990.
18. The Age of Wrath, A History of the Delhi Sultanate, Abraham Eraly, Penguin-Viking, 2014.
19. A History of India, Volume One, Romila Thapar, Penguin Books, 1966, Reprint 1975.
20. A New History of Indo-Pakistan (up to 1526 A.C.), K. Ali, Aziz Publishers, 1990.

21- ڈاکٹر مبارک علی، ”ہندوستان کی کہانی“، نیشنل بک فائونڈیشن، 2009ء

22. History of Muslim Civilization in India and Pakistan, A Political and Cultural History, S.M. Ikram, Institute of Islamic Culture (3rd edition), 1982, Reprinted by student's Books Aid, Karachi, 1991.

23- آبِ کوثر، اسلامی ہندوپاکستان کی مذہبی اور علمی تاریخ، عہدِ مغلیہ سے پہلے، شیخ محمد اکرام، ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، طبع پانزدہم، 1992ء

24. Medieval India Under Mohammedan Rule (A.D. 712-1764), Stanley Lane-Poole, Reprint, Sang-e-Meel Publications, 1991.

25. The Decline and Fall of the Roman Empire, Edward Gibbon, The Modern Library, New York.

26. The Venture of Islam, Conscience and History in a World Civilization, Marshall G.S. Hodgson, Vanguard Books, 2004.

27. Constitutional and Political History of Pakistan, Hamid Khan, Oxford University Press, 2nd edition, 2009, 5th Impression 2014.

28- رودِ کوثر، اسلامی ہندوستان اور پاکستان کی مذہبی اور علمی تاریخ، عہدِ مغلیہ، شیخ محمد اکرام، ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، 2کلب روڈ، لاہور، طبع چہاردہم، 1992ء

29. After Tamerlane, The Rise & Fall of Global Empires, 1400-2000, John Darwin, Penguin Books, 2007.

30. The Mughal Throne, The Saga of India's Great Emperors, Abraham Eraly, Phoenix, 2004.

31. India, An Introduction, Khushwant Singh, Vision Books, 2nd edition, 1998, Reprint 2007.

32. Punjab, A History from Aurangzeb to Mountbatten, Rajmohan Gandhi, Aleph, 2013.

33. Muslim Zion, Pakistan as a Political Idea, Faisal Devji, Harvard University Press, Cambridge, Massachusetts, 2013.

34. The Punjab Bloodied, Partitioned and Cleansed, Ishtiaq Ahmed, Oxford University Press, 2014.

35. Einstein, His Life and Universe, Walter Isaacson, Pocket Books 2007.

36. Tinder Box, The Past and Future of Pakistan, M.J. Akbar, Horper Collins Publishers India, 2011.

37. The Pakistan Paradox, Instability and Resilence, Christophe Jaffrelot, Translated by Cynthia Schoch, Random House India, 2015.

38- کتابِ مقدس، عہد نامہ عتیق اور جدید، پاکستان بائبل سوسائٹی 2010ء

39. Creating A New Medina, State Power, Islam, and the Quest for Pakistan in Late Colonial North India, Venkat Dhulipala, Cambridge University Press, 2015.

40 Indian Independence Act, 1947.

41 Pakistan Penal Code, 1860.

42. History, A Short Introduction, John H. Arnold, Oxford University Press, 2000.

43. What is History, Edward Hallett Carr, University of Cambridge Press, 1961.

44. A Companion to the Philosophy of History and Historiography, Aviezer Tucker (ed.), Blackwell Publishing, 2009.

45. New Contributions to the Philosophy of History, Daniel Little, Springer, 2010.

46. What Happened to History?, Willie Thompson, Pluto Press, 2000.

☆☆......☆☆

View publication stats